معارفِ لطیف



تدوین و ترتیب

محمد یوسف شیخ

For:

Prof. Muhammad Iqbal Mujaddadi
Ex-Chairman, Department of History,
Government Islamia College,
Civil Lines, Lahore.

From: [signature] 15-4-2014.
SIKANDER ALI CHANNA
Vice Principal (Academics)
Cadet College Larkana

سر! اس مجموعہ میں میرا مضمون صفحہ ۱ — 20 ہے۔
اس میں سندھ کی سوانح کا مستند حوالہ دیا گیا ہے۔ جو کہ
ڈاکٹر بلوچ مرحوم کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔

معارفِ لطیفؒ

تدوین و ترتیب

محمد یوسف شیخ

کیڈٹ کالج لاڑکانہ

137016

کتاب	معارفِ لطیفؒ
مدون / مرتب	محمد یوسف شیخ
ناشر	پرنسپل کیڈٹ کالج لاڑکانہ
طابع	ایلیا پرنٹرس، نزد جی۔پی۔او لاڑکانہ
کمپوزر	مائیکرو پولی گرافکس لاڑکانہ
سرورق	ممتاز علی چنا
سال	۲۰۰۰ء (مئی)
تعداد	ایک ہزار
قیمت	

فہرست

مرے ابیاتِ پُر معنی کی کیا بات
شگفتہ صورتِ آیاتِ قرآں
دلِ انساں پہ کھُلتے جا رہے ہیں
رموزِ معرفت اسرارِ عرفاں

(شاہؔ)

عرضِ مرتب

سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ دنیا کے ان چند نامور شعرآء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کے کلام "شاہ جو رسالو" میں نہ صرف انسان دوستی، امنِ عالم کے لیے دعا اور حیاتِ انسانی کی جملہ کیفیات لطیف انداز میں موجود ہیں اور انکے دردمندانہ لہجے کا عکسِ جمیل ہیں بلکہ اسکے ساتھ ساتھ ان کا کلام فکر و فن کا ایک حسین امتزاج ہے۔ جس میں شاہ لطیفؒ نے اسلامی تصوف کے اسرار و رموز کو سندھ کی لوک داستانوں کے ذریعے تمثیلی انداز میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

شاہ لطیفؒ کی شاعری کے فکر اور پیغام کا سرچشمہ توحید اور حبِ رسول ﷺ ہیں۔ شاہ لطیفؒ کے کلام میں حیاتِ انسانی کے گوناگون مضامین کا ایک سمندر موجزن ہے، جسے ہر دور کا ادیب اور عالم اپنے اپنے اندز سے بیان کرتا رہیگا۔ ان کی فکر میں زندگی کے مختلف مراحل کے دوران انفرادی اور اجتماعی کردار کے بارے میں بڑی دقیق معانی اور اعلیٰ فکری علامتیں پوشیدہ ہیں۔ شاہ لطیفؒ کا پیغام کسی دور یا عرصے کے لیے نہیں ہے، ان کی اعلیٰ فکر و فہم کسی خاص قوم اور کسی خطے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کا پیغام عالمگیر اور اس کی روح اسلامی ہے۔

ضرورت تھی اس بات کہ شاہ لطیفؒ کے اعلیٰ افکار سے وطنِ عزیز کے اردو دان طبقے کو بھی روشناس کرایا جائے تاکہ انسانی برادری کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان کے افکار سے استفادہ کر سکے اور ان کے شیریں و آفاقی کلام سے محظوظ ہو سکیں۔

کیڈٹ کالج لاڑکانہ کی یہ روایت ہے کہ ہر سال سیرت کانفرنس، یوم اقبالؒ اور یوم لطیف کے مواقع پر بطور خراجِ عقیدت، سیرت فہمی، اقبال شناسی اور عرفان لطیف کے لیے اساتذہ اور طلباء کے مضامین پر مشتمل کتابیں منظرِ عام پر لا تا رہا ہے۔

اس سے پہلے ہم یومِ لطیف کے دو مواقع پر اساتذہ اور طلبا کی تحاریر پر مشتمل مضامین کے مجموعوں کی دو کتابیں "عالم سندو دوست" (اردو، سندھی اور انگریزی میں) اور "شاہ عبداللطیف بھٹائی: سوانح و افکار" پیش کر چکے ہیں۔ جن کو پورے ملک میں توقع سے

زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ لیکن اس سال ''یومِ لطیف'' کے موقع پر ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں شاہ لطیفؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ان مشاہیر اور علماء کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیئے جنھوں نے کسی نہ کسی حوالے سے شاہ لطیفؒ کی فکر اور سوانح پر گراں قدر اور بیشھا مضامین لکھنے کا کام کیا ہے۔ اس لئے ہم نے مشاہیر کے ان مضامین کو جمع کر کے شایع کرنے کا پروگرام بنایا جو اس سے قبل مختلف جرائد و رسائل میں بکھرے پڑے تھے اور اس انتخاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ شاہ لطیفؒ کی اعلیٰ فکر کا زیادہ سے زیادہ احاطہ ہو جائے۔ گویا یہ کتاب دریاہ کو کوزے میں بند کرنے کی مصداق ہے۔

شاہ لطیفؒ کا کلام اسلامی تعلیمات کا بازگشت ہے۔ انکے اشعار وہ نغمۂ صحرا ہیں جن سے دلوں کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ شاہ لطیفؒ کا کلام وہ بادِ نسیم ہے جس کا منبع حبِ رسول ﷺ ہے۔

ہم یہ کتاب ''معارفِ لطیفؒ'' انتہائی ادب و احترام کے ساتھ شاہ لطیفؒ کی حضور میں خراجِ عقیدت کے طور پر اور ان مشاہیر کی خدمت میں بطورِ خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں جن کے مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں اور ان شائقینِ کلاسیکی علم و ادب کے سامنے تحفے کے طور پر پیش کرتے ہیں جو سندھی زبان پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے شاہ لطیفؒ کے عالمگیر اعلیٰ فکری سرمایہ سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے لیکن باوجود اسکے وہ فکرِ لطیفؒ سے آشنا ہونے کی تڑپ ضرور رکھتے ہیں۔

اس مجموعہ مضامین کو ترتیب دیتے ہوئے ہم نہایت ادب و احترام کے ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔ بھٹ شاہ ثقافتی مرکز، انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی اور محکمۂ اطلاعات سندھ کو کہ جن کی اشاعتوں سے اس کتاب کے لیے ہم نے مواد سمیٹا۔

میں جناب سکندر علی چنا صاحب کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تدوین میں گراں قدر معاونت فرمائی۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

محمد یوسف شیخ

۱۶ مئی ۲۰۰۰ء

۱۱ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ

تحقیق: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

تلخیص و ترجمہ: سکندر علی چنا

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

(۱۱۰۲ھ - ۱۱۶۵ھ)

حسب نسب: شاہ عبداللطیفؒ، سندھ کے "متعلوی" یعنی "متعلوی" یا مٹیاروی سادات کے "کریم پوٹا" خاندان میں سے تھے جو کہ شجرے میں "جراڑ" یا "جراڑ۔ پوٹا" کی ایک بڑی شاخ میں سے ہے۔ اس شاخ کے بزرگ سید جراڑ (جلال) تھے جو کہ سید شرف الدین کے فرزند تھے۔ اس لحاظ سے، "جراڑ پوٹا" بیک وقت "شرف پوٹا" بھی ہیں۔

شرف الدین کے داد سید حیدر، ہرات شہر کے سید میر علی کے فرزند تھے جن کا شجرۂ نسب امام موسیٰ کاظمؒ سے جا ملتا ہے۔ اس لحاظ سے مٹیاروی سادات، شہر ہرات کے، ان کے بڑے دادا سید میر علی کی اولاد ہونے کی وجہ سے "ہراتی سید" ہیں لیکن سید میر علی ہراتی کے بالائی نسب کے اعتبار سے "کاظمی سید" ہیں۔ مٹیاروی سادات کے شجرے کے مطابق، سید حیدر پہلے سندھ میں آئے اور ہالا کنڈی (قدیم شہر ہالا) میں آکر سکونت اختیار کی۔ جہاں "ہالا" قبیلے کے رئیس شاہ محمد بن دریا خان نے اپنی بیٹی اُن کے نکاح میں دی، جسکے بطن سے انہیں سید (میر) علی نامی بیٹا پیدا ہوا۔ سید حیدر واپس ہرات چلے گئے اور وہیں پر اُن کی وفات ہوئی۔ اُن کے فرزند سید میر علی سندھ میں ہی رہے اور "کریم پوٹا" و دیگر سادات مٹیاری۔ سید میر علی سندھی ہی کی اولاد ہیں۔

"کریم پوٹا" شاخ: سن ۹۴۴ ہجری میں، سید میر علی سندھی کے فرزند شرف الدین کی اولاد (شرف پوٹوں) کی "جراڑ" یا "جراڑ پوٹا" شاخ میں لعل محمد شاہ کے گھر عبدالکریم شاہ پیدا ہوئے جو اپنی دینداری، درویشی، فکر و فہم اور تصوف و توکل کی وجہ سے

مشہور ہوئے۔ لعل محمد شاہ عابد وزاہد اور سلسلۂ سہروردیہ کے سالک تھے۔ آپکی اکثر بسر اوقات "لاڑ" کی طرف ہوتی تھی اور وفات بھی وہیں پائی اور ربدین شہر سے ڈیڑھ میل شمال۔ مشرق کی طرف سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ شہاب الدین کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ چونکہ سید لعل شاہ کے مریدوں اور معتقدوں کی اکثریت "لاڑ" کے علاقے "بلڑی" میں رہائش پذیر تھی لہٰذا اُن کی محبت و عقیدت کی وجہ سے لعل شاہ کے فرزند سید عبدالکریم شاہ، تکمیلِ تعلیم اور شادی کی بعد بمع اپنے اہل و عیال، مٹیاری سے نقل مقانی کر کے، "بلڑی" میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں سن ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ع میں وفات پائی۔ بعد میں اُس علاقے کو "بلڑی شاہ کریم" کہا گیا۔ جواب تک اُسی نام سے مشہور ہے۔ جہاں آپ کی درگاہ مرجعِ خلائق ہے۔ شاہ عبدالکریمؒ نے سلسلۂ تصوف میں اپنے والد کے سہروردی طریقہ سے نسبت باقی رکھی لیکن وہ قادری طریقے سے زیادہ وابستہ ہوئے۔ میاں شاہ عبدالکریم کے آٹھ بیٹے ہوئے، جن میں چار کی اولاد ہوئی اور اُن کی نسل چلی اور اپنے دادا کے نام "شاہ عبدالکریم" کی نسبت سے "کریم پوٹا" کہلائے۔ شاہ عبدالکریم کے تیسرے بیٹے جلال شاہ (جمال شاہ) کی اولاد سے، شاہ عبداللطیفؒ کے والد شاہ حبیبؒ پیدا ہوئے۔

شاہ حبیبؒ اور اُن کا خاندان : شاہ حبیبؒ کے دادا جلال شاہ یا جمال شاہ غالباً اپنے والد میاں شاہ کریم کے زمانے میں اپنا زیادہ تر وقت، مٹیاری اور ہالا کی طرف گذارا کرتے تھے۔ جلال شاہ ہالا کی طرف تھے کہ کچھ لٹیروں نے ایک خاتون کو لوٹنا چاہا، جلال شاہ، اُس خاتون کو لٹیروں سے بچاتے ہوئے شہید ہوگئے اور "گولے پیر کے قبرستان" میں دفن ہوئے۔ یہ قبرستان تحصیل شہدادپور کی دیہہ "جما" میں بھٹ شاہ سے تقریباً سات میل شمال کی طرف ہے۔ جلال شاہ کے شہید ہونے کے بعد آپکے اہل و عیال اگر مٹیاری میں تھے تو بھی واپس اپنے دادا کے پاس "بلڑی" (سیدپور) میں جا کر رہے۔

جلال شاہ (جمال شاہ) کے فرزند عبدالقدوس شاہ بھی عابد اور درویش تھے جنھوں

نے وہیں "ٹلڑی" میں وفات پائی اور اپنے دادا میاں شاہ کریمؒ کی مزار کے نزدیک جنوب۔ مشرق کی طرف دفن ہوئے۔

عبدالقدوس شاہ کے دو بیٹے تھے : حبیب اللہ شاہ (شاہ حبیبؒ) اور عبدالرشید شاہ، ان دونوں کی نسل چلی۔ میاں شاہ کریمؒ کے بعد تمام کریم پوتوں میں شاہ حبیبؒ ہی صاحبِ زہد و عبادت و فقر و فضیلت ہوئے اور آپکے اعلیٰ اخلاق، فیض اور فقیری کا خصوصی اثر آپکے فرزند شاہ عبداللطیفؒ پر ہوا اور تمام کریم پوتوں میں سے شاہ حبیبؒ ہی شاعر ہوئے جن کی شاعری کا اثر بھی شاہ عبداللطیفؒ نے قبول کیا۔

شاہ حبیبؒ اپنے والد کے وقت میں، یا اس کی وفات کے بعد، کچھ وقت کے لیے آکر مٹیاری میں رہائش پذیر ہوئے لیکن اقارب (رشتہ داروں) کی چپقلش کی وجہ سے، مٹیاری کے درویش سخی ہاشم شاہ کے کہنے پر مٹیاری کو خیرباد کہا۔

شاہ عبداللطیفؒ کی ولادت : روایت ہے کہ شاہ حبیبؒ کو اولاد نہیں ہوتی تھی اور مٹیاری شہر کے مست درویش سخی ہاشم شاہؒ سے دعا کے لیے کہا۔ جس نے کہا کہ آپکو بیٹا پیدا ہوگا اُس کا نام عبداللطیف رکھنا۔ پھر جب بیٹا پیدا ہوا تو شاہ حبیبؒ نے اس کا نام عبداللطیف رکھا لیکن وہ چھ وفات پا گیا۔

اُسی گھر سے دوسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام بھی عبداللطیف رکھا گیا لیکن وہ بھی انتقال کر گیا۔ پھر اُسی گھر سے تیسرا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام بھی عبداللطیف رکھا گیا جو باقی رہا اور وہی ہمارا ممدوح شاہ عبداللطیفؒ ہوا۔ آپ کا سنِ ولادت صفر ۱۴ سن ۱۱۰۲ ہجری ہے۔

شاہ عبداللطیفؒ کی والدہ : شاہ عبداللطیفؒ کی والدہ کا تعلق سندھ کے سماٹ قبیلے ڈیروؒ سے تھا۔ آپکی والدہ کے والدِ محترم کا نام عرس فقیر ڈیرو تھا جو ملتان کے ولی غوث بہاء الدین زکریاؒ کے خلیفے قندر فقیر ڈیرو کی اولاد میں سے تھے جو "گنباٹ دھنی" کہلاتے تھے۔ گنباٹ دھنی کا مطلب ہے گنباٹ والی اراضی کے رکھوال ولی۔ گنباٹ ایک بہت بڑی اراضی کا

نام تھا۔ موجودہ صورتحال کے مطابق، تحصیل شہداد پور کی حدود میں، شہداد پور اور ٹنڈو آدم کے درمیان ریلوے لائن سے مغرب کی طرف جاتے ہوئے بڑی نہر سکھر بڑاج تک، شمال میں ''ملدسی'' اور ''گولے پیر کے قبرستان تک ''اور جنوب میں ''ملاں مکھن'' گاؤں تک تھی۔ سمہ دور حکومت سے یہ ایک بہت بڑی آباد اراضی تھی۔ ترخانوں کے دور میں یہ اراضی شاہ قاسم بیگلار کی جاگیر میں تھی۔ جس نے یہاں گنباٹ والا قلعہ تعمیر کروایا تھا، جس کے آثار ''مٹھن فقیر ڈیرے'' کے گاؤں سے کچھ ہی دور مغرب کی طرف ۱۹۷۶ع تک موجود تھے جو راقم (مصنف) نے خود دیکھے۔

عرس فقیر ڈیرے کی دختر سے شادی کے بعد، شاہ حبیب بھی سسرال کے پڑوس میں آکر مکین ہوئے جہاں آپ کا گھر ''سئی قندر'' کے تاریخی قبرستان کے بلکل نزدیک مغرب کی طرف تھا۔ شاہ حبیبؒ کے اِس گھر والی جگہ موجودہ روینیو کارڈ کے مطابق سروے نمبر ۱۳۴، دیھ ''سئی قندر جاگیر'' تحصیل شہداد پور میں ہے۔ مقامی طور پر ۶۰۔۱۹۵۰ء تک وہاں کے مقامی لوگوں کو اس کی خبر تھی۔ سئی قندر کے تاریخی قبرستان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر، شمال ۔ مغرب کی طرف، موجودہ نہر کے مشرق میں، شاہ حبیبؒ کے گھر کے قریب ایک کھڈ تھی جسے ''سایا تن جی کھڑ'' کہتے تھے، اُس کے قریب ۱۹۳۰ء تک کنڈے کے درخت تھے جنہیں ''شاہ حبیب جا کنڈا'' کہتے تھے اِسی جگہ شاہ حبیبؒ کی حویلی تھی۔ اُسی حویلی میں شاہ حبیبؒ کے پہلے دونوں بیٹے پیدا ہوئے جو بچپن میں فوت ہو گئے تھے اور جنہیں ''سئی قندر کے تاریخی قبرستان'' میں دفنایا گیا۔ دونوں کی قبریں اب تک موجود ہیں۔ تیسرے بیٹے شاہ عبداللطیفؒ بھی اسی حویلی میں پیدا ہوئے، پرورش پائی اور جوان ہوئے۔ ہجری سن کے مطابق وہ سال ۱۱۰۲ ہجری تھا۔

بھائی بہن : شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے پہلے دو بیٹے شاہ حبیبؒ کو پیدا ہوئے تھے جن کا بالترتیب نام عبداللطیف ہی رکھا گیا جو بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ شاہ عبداللطیفؒ کی ایک بہن بھی تھی جن کا نام بی بی بتول تھا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی جائے ولادت : کے بارے میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کچھ مؤرخین نے "بھیء پور" لکھا ہے جو کہ حیدر آباد تحصیل میں ہے اور کچھ نے "بالا حویلی" لکھا ہے جو کہ تحصیل ٹنڈو الہیار میں ہے۔ یہ دونوں مقاماتِ ولادت غلط ہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی جائے ولادت، موجودہ بھٹ شاہ سے مشرق کی طرف "سئی قندر" کے قریب ڈیرہ فقیروں کے گاؤں کے نزدیک تھی۔ کیونکہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا ننھیالی خاندان ڈیرہ قوم کا اصل علاقہ بھی یہی تھا۔ اکثر مؤرخین نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی والدہ کو مخدوم عربی کی دختر لکھا ہے جو دیانی خاندان سے تھے لیکن یہ تاریخی طور پر غلط ہے اس لیے کہ مخدوم عربی دیانی دسویں صدی ہجری میں ہو گذرے ہیں جبکہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی ولادت ۱۱۰۲ ہجری میں ہوئی ہے۔

بچپن کا ساتھی اور خاص خلیفہ : شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے بچپن کے ۱۰۔۱۲ سال اپنے ننھیالی خاندان ڈیرہ فقیروں میں "سئی قندر" اور "گنباٹ" کے علاقے میں گذارے۔ اس بچپن کے دور میں آپ کے ساتھی اجن فقیر ڈیرو، سکھ فقیر ڈیرو اور جانی فقیر ڈیرو تھے۔ لیکن شاہ عبداللطیفؒ کے سب سے زیادہ قریبی اور پیارے ساتھی آپ کے سگے خالہ زاد بھائی محمد عالم ڈیرو تھے جو بعد میں آپکے خاص فقیر اور خلیفہ بنے۔

شاہ صاحب نے انہیں "بھٹ شاہ" پر سماع اور ذکر کا سربراہ مقرر کیا اور انہیں "محمد عالم پچو عالم" کہہ کر بلایا۔ لیکن عام طور پر لوگ انہیں "خلیفہ محمد عالم ذاکر" کہتے تھے۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد فقراء کے پورے نظام کو سنبھالا اور بڑی خدمات سر انجام دیں۔ ان کا انتقال بھی "بھٹ" پر ہی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ خلیفہ محمد عالم کی قبر بھٹ شاہ پر شاہ عبداللطیفؒ کے روضے کے باہر جنوب کی طرف اور تمر فقیر کی تجہ سے مشرق کی طرف قبروں کی شمالی قطار کے تسلسل میں جنوب والی قطار میں مغرب سے دوسرے نمبر پر ہے۔

تعلیم و تربیت : شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے زمانے میں، مکتب کی تعلیم کا دور

تھا۔ جس کے مطابق قرآن شریف، سندھی اور ابتدائی فارسی تعلیم معیاری سطح پر دی جاتی تھی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے والدین صاحبانِ علم و نظر تھے لہٰذا شاہ صاحب کی تعلیم اور تربیت اُن ہی کے زیرِ اثر گھر میں ہوتی رہی، البتہ لطیفؒ جب کچھ بڑے ہوئے تو روایات کے مطابق شاہ حبیبؒ نے عبداللطیفؒ کو اپنے دور کے نیک اور پارسا اساتذہ کے پاس قرآن شریف پڑھنے کے لیے بٹھایا۔ ان میں سے خاص استاد میاں نور محمد بھٹیؒ تھے جنھوں نے بعد میں شاہ لطیفؒ کو مکتبی تعلیم دی۔ میاں نور محمد بھٹیؒ، کھنبات دھنی ڈیرہ فقیروں کے علاقے سے آٹھ میل کے فاصلے پر "وائیں" کے رہنے والے تھے جو موجودہ شہر اُڈیرو لال (ضلع حیدر آباد) سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ میاں نور محمد بھٹی شاہ حبیبؒ کے محبتی اور معتقد تھے۔ شاہ حبیبؒ کی وفات کے بعد بھی میاں نور محمد بھٹیؒ سے شاہ لطیف ملتے رہے اور ان سے سیکھتے رہے اور جب شاہ لطیفؒ نے باقاعدہ اپنی رہائش "بھٹ" پر اختیار کی تو اپنے محترم استاد میاں نور محمد بھٹیؒ کو بھی بلا کر اپنے پاس ٹھہرایا اور وہاں انہیں ایک "اوطاق" بنوا کر دی، جو اُن کے نام کی نسبت سے "میاں جی اوطاق" کے نام سے مشہور تھی اور جو ۱۹۵۴ء تک موجود اور راقم نے خود دیکھی تھی۔ بعد میں درگاہ کی طرف جانیوالے راستے کو کشادہ کرنے کیلئے بلڈوز کر دی گئی۔ اِس "میاں کی اوطاق" میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جب بھی شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اپنے استاد کے پاس جاتے تو اُس چبوترہ پر بیٹھا کرتے تھے۔ میاں نور محمد بھٹیؒ کے فرزند میاں ولی محمد کی شاہ لطیف کے پاس بڑی عزت تھی۔ یہاں تک کہ شاہ لطیفؒ کی وفات کے بعد میاں ولی محمد نے ہی شاہ لطیف کی میت کو غسل دلوایا اور نمازِ جنازہ پڑھائی۔

روحانی فیض : شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اپنے والد شاہ حبیبؒ سے دست بیعت تھے جو سلسلۂ قادریہ کے صاحبِ حال بزرگ تھے۔ اِس کے علاوہ مٹیاری کے بزرگ سید ہاشم شاہؒ کی نگاہِ فیض بھی آپ پر تھی لیکن ذاتی ارادت میں "اویسی" تھے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عاشق اویس قرنیؒ کی طرح غائبانہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے

رشد و ہدایت کا فیض حاصل کیا۔ اِس سلسلے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ نے اُس دور کے ٹھٹہ شہر کے ممتاز عالم مخدوم محمد معین ٹھٹوی کو ایک خط لکھا جس میں سلسلۂ اویسہ کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ غرضیکہ شاہ لطیف ؒ اپنے طور پر اویسی طریقہ میں اعلیٰ مدارج کو پہونچے۔

شادی : شاہ حبیب ؒ کے ایک عقیدت مند "کوٹڑی مغل" کے رئیس مرزا بیگ مغل تھے جس نے خیر و برکت کی خاطر شاہ حبیب ؒ کو "کوٹڑی مغل" لا کر بسایا کیوں کہ اُسے دُعا اور سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ کوٹڑی کا شہر شاہ حبیب ؒ کے گاؤں "سئی قندر" سے آٹھ نو میل مغرب۔ جنوب میں واقع تھا۔ جب سن ۱۱۲۴ ہجری میں "کوٹڑی مغل" کے رئیس مرزا بیگ مغل دل قبیلے کے لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے تو اس کے اہل و عیال بے یار و مددگار اور بے سہارا ہو گئے۔ شاہ حبیب ؒ کے علاوہ ان کا کوئی بھی سہارا نہ تھا۔ مرزا بیگ مغل کا ایک بیٹا تھا جو کہ جلد ہی فوت ہو گیا اور صرف مرزا بیگ مغل کی دختر نیک اختر سیدہ یا سعیدہ بیگم باقی بچیں۔ شاہ حبیب ؒ نے اپنے معتقد کے خاندان کو سہارا دینے کے لیے اُن کی مرضی سے، اپنے بیٹے شاہ عبداللطیف ؒ کو راضی کرنے کے بعد مرزا بیگ مغل کی بیٹی سیدہ یا سعیدہ بیگم سے شاہ لطیف ؒ کا نکاح پڑھوایا۔ شاہ لطیف ؒ کی شادی کے وقت عمر ۲۴ سال تھی۔ شاہ لطیف ؒ کو کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ایک بچہ ماں کے پیٹ میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

فکری ماخذ : روایات میں آتا ہے کہ تین کتابیں ہمیشہ شاہ لطیف ؒ کے ہمراہ ہوتی تھیں: (۱) قرآن مجید (۲) اپنے بڑے دادا شاہ کریم ؒ بلڑی والے کی ملفوظات و سوانح پر مشتمل کتاب "بیان العارفین" جو اُن کے ایک مرید محمد رضا نے مرتب کی تھی اور (۳) مثنوی مولانا رومی ؒ، جو کہ ٹنڈو قیصر۔ ڈاسوڑی کے ایک عالم و درویش محمد عارف کے فرزند محمد صالح آپ کی محفل میں پڑھ کر سناتا تھا۔ اور یہ سلسلہ شاہ لطیف ؒ کی وفات تک جاری رہا۔

سیر و سیاحت : شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ نے خالق کائنات کی قدرت، کائنات کی وسعت، خالق اور مخلوق کے رشتہ کی حقیقت اور دنیاوی زندگی میں انسانی اخلاق اور کردار

کی کیفیات کو سمجھنے کیلئے خوب سیر و سیاحت کی۔اِس سلسلے میں آپ نے کچھ، جیسلمیر، باڑہ میر اور مغرب کی طرف سندھ کے کوہستان اور لسبیلہ، سندھ کے مشرقی، شمالی اور تھر کے علاقوں کی بھی سیر کی۔اپنے بڑے دادا شاہ کریمؒ کے مزار کے تعمیری سامان خریدنے کیلئے ملتان بھی گئے۔ سفر اور سیر و سیاحب کے دوران شاہ لطیفؒ نے سندھ کے ہر طبقے اور ہر پیشہ کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اُن کی روز مرہ زندگی کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ و مطالعہ کیا جس کا ثبوت آپکی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔

ذوقِ تعمیر : شاہ لطیفؒ نے جب سن ۱۱۴۲ء ہجری میں "بھٹ" پر مستقل قیام کا ارادہ کیا تو وہاں اپنے لیے، اپنے والد کے لیے اور اپنے حرم کے لیے کچھ حجرے تعمیر کروائے اُس کے ساتھ ایک باغیچہ بھی رکھا۔ پھر تین گنبدوں والی مسجد خود کھڑے ہو کر بنوائی اور خلفاء و معتقدین کیلئے اپنے عصا کی نوک سے اُن کے مکانات کی تعمیر کے لیے حدود مقرر کیں۔

جب دو سال بعد آپکے والد شاہ حبیبؒ نے انتقال کیا تو اُن کی قبر پر گنبد تعمیر کروایا۔

شاہ لطیفؒ کو اپنے بڑے دادا شاہ کریمؒ بلڑی والے سے بڑی عقیدت اور انسیت تھی یہی وجہ ہے کہ سن ۱۱۵۴ ہجری میں شاہ لطیفؒ نے اُن کے مزار پر ایک خوبصورت گنبد کے ساتھ روضے کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ مزار سے ملحق شمال میں ایک عالیشان جامع مسجد بھی تعمیر کروائی۔ پھر مسجد کے نزدیک جنوب۔ مشرق میں اپنے دادا عبدالقدوس شاہ کے مزار پر بھی گنبد تعمیر کروایا۔

شاہ کریمؒ بلڑی والے کے مزار کی تعمیر اور جامع مسجد کی تعمیر و زیبائش کیلئے شاہ لطیف بنفسِ نفیس خود ملتان تشریف لے گئے اور وہاں سے خوبصورت کاشی کی اینٹیں (Tiles) خرید کر لائے۔اِس کے ساتھ ساتھ وہاں سے کچھ کاریگروں کو بھی اپنے ساتھ بلڑی لے آئے جنھوں نے بُلڑی میں بیٹھ کر مزید اینٹیں تیار کیں۔ یہ سارا کام تین سال کے عرصے میں سن ۱۱۵۶ ہجری میں مکمل ہوا۔

اس کام سے فارغ ہو کر شاہ لطیفؒ نے بھٹ پر جلدی میں تعمیر شدہ حجرات کو مزید خوبصورت طرز پر بنوایا۔

مشاہیر سے ملاقاتیں : مشاہدۂ حق اور معرفتِ نفس کی خاطر، شاہ لطیفؒ ۲۰ سال کی عمر سے ہی سندھ کے اولیاء اللہ اور درویشوں سے ملنے کیلئے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اُن بزرگانِ دین میں سے چند بزرگوں کے نام یہ ہیں :

(۱) نصرپور کے مشہور صوفی شاعر اور بزرگ سید عنایت اللہ شاہ عرف میاں شاہ عنات سر فہرست ہیں جو کہ نصرپور کے رضوی سادات میں سے تھے اور سکھر کے شاہ خیر الدین قادریؒ سے سلسلۂ قادریہ میں منسلک تھے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اپنے والد شاہ حبیبؒ کے ہمراہ ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ شاہ عنات کی شاعری کا شاہ لطیفؒ کی شاعری پر گہرا اثر ہے۔ اندازاً ۱۱۲۰ ہجری سے لے کر سن ۱۱۳۲ ہجری تک، تقریباً بارہ سال تک شاہ لطیفؒ کی شاہ عنات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

(۲) میاں صابر ولہاریؒ : یہ اپنے دور کے جید عالم اور بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ ان کی دینی درسگاہ پرگنہ ولہار (ٹنڈوالہیار سے جنوب۔ مشرق کی طرف) میں تھی۔ جو کہ تالپوروں کے دور میں بڑے اوج کمال کو پہونچی۔ میاں صابر ولہاریؒ ، سمہ خاندان کی "ہرند" شاخ سے تھے اور قرآن کی تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے شاہ لطیفؒ خود چل کر ان کے پاس گئے تھے۔ میاں صابر ولہاریؒ نے سن ۱۱۳۵ ہجری میں وفات پائی۔

(۳) حافظ میاں اسحاق درس مشائخ پوٹا عرف میاں اسحاق بوری : ان کا مکتب "میے مشائخ ہوتھی" والے مقام سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جنوب میں موجودہ گاؤں "مُلَکو دڑو" (تحصیل ٹنڈوالہیار) میں واقع تھا جہاں وہ بچوں کو نہایت پیار سے پڑھاتے تھے۔ بڑے عابد اور زاہد بزرگ تھے۔ شاہ لطیفؒ جب ان سے ملے تو پوچھا کہ "ادا! پڑھاتے ہو

یا خراب کرتے ہو؟" حافظ اسحاق نے جواب دیا: "اگر خراب کرونگا تو بھی لطیف ہونگے" (یعنی اگر حروف میں خراب ہوئے تو بھی اخلاق میں لطیف (نیک اور پاک) بنیں گے۔ شاہ لطیفؒ اکثر ان کے پاس سے جایا کرتے تھے۔

(۴) میاں محمد مبین تھرائی: یہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور درسگاہ "چوٹیاریوں" (ضلع سانگھڑ) کے بانی تھے۔ یہ درسگاہ بعد میں ٹالپوروں کے عہد میں بڑے عروج کو پہونچی۔ یہ مخدوم محمد ہاشمؒ کے ہم عصر اور ان کے دوست تھے۔ شاہ لطیفؒ ان کے پاس اکثر ساون کے موسم میں آتے تھے۔

(۵) مخدوم دین محمد صدیقی سہروردی سیوستانی: یہ شاہ لطیفؒ کے بہت ہی قریبی دوست تھے اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی دستار دے کر پگ مٹ یار بنے تھے۔ مخدوم موصوف علومِ ظاہری اور تصوف و طریقت میں بڑے عاملِ کامل تھے۔ اصل "پاٹ" کے رہنے والے تھے بعد میں سیوہن میں مقیم ہوئے۔

(۶) میاں محمد صلاح بن میاں محمد عارف: یہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے معتقد اور مرید تھے اور مثنویٔ مولانا رومیؒ کے بڑے شارح اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ سندھی میں "بزغل جا کلما" تصنیف کیے جو کہ "محمد صلاح جي سنڌي" کے نام سے مشہور ہوئے۔ شاہ لطیفؒ کا سفر نامہ بھی انہوں نے لکھا تھا جو بعد کے قریبی دور میں ضائع ہو گیا۔ میاں محمد صلاح کی شاہ لطیفؒ کے پاس بڑی قدر و قعت تھی اور انہیں "خلیفہ محمد صلاح" کہہ کر بلاتے تھے اور سفر میں ہمیشہ شاہ لطیفؒ کے ساتھ رہتے تھے اور روزانہ مثنوی کا وعظ کرتے تھے۔

(۷) فقیر محمد حافظ عرف میاں صاحبڈنہ فاروقی: سچل سرمستؒ کے دادا، درازا شہر سے باہر پیلو کے درختوں کے جھنڈ میں گوشہ نشین ہو کر محوِ عبادت تھے کہ شاہ لطیفؒ وہاں سے گذرتے ہوئے اُن سے ملے۔ شاہ لطیفؒ کے اشارے پر میاں صاحبڈنہ بیراگ سے نکلے اور ایک کنواں کھدوایا اور مسجد بنوائی۔

---

(۸) مخدوم محمدی کھہڑا کے مخدوم عبدالرحمان شہید کے فرزند تھے۔ شاہ صاحب نے ان سے ایک مرتبہ ملاقات کی تھی۔ اُس وقت شاہ لطیفؒ کے ساتھ محفلِ سماع میں کلام پڑھنے والے فقرآءؔ بھی تھے جن کے ساتھ دنبورے (دنبورہ ایک ساز ہے) بھی تھے۔ مخدوم محمد صاحب چونکہ شریعت کے پابند تھے اس لیے مزامیر کا سبب معلوم کیا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے عذر بیان کرتے ہوئے جواب دیا کہ چونکہ سماع بلمزامیر ہماری روحانی خوارک بن چکا ہے اس لیے ہم مجبور ہیں۔ مخدوم محمدی صاحب نے کہا کہ یہاں آپکو سماع بلا مزامیر کی اجازت ہے۔ آپ وہ سن سکتے ہیں۔ شاہ لطیفؒ نے قبول کیا اور مزامیر (دنبورے) اندر حجرے میں رکھوا دیے۔ رات کو عشآء کی نماز کے بعد جب فقرآءؔ نے حجرے کے باہر سوز اور گداز سے کلام گانا شروع کیا تو اندر حجرے میں مزامیر خود بخود بجنے لگے۔

مخدوم محمدی نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ یہ نرالی حالت ہے اور شاہ لطیف پر کوئی دوش نہیں ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے مخدوم کے پاس ایک ہفتہ قیام فرمایا۔ مخدوم محمدی خود بھی سلسلۂ اویسہ کے ایک بڑے شیخ اور مادر زاد ولی تھے۔

(۹) سید محمد بقا لکیاری (شہید ۱۱۹۲ھ) : جناب پیر صاحب محمد راشد ''روضہ ۔دھنی'' کے والد تھے۔ شاہ لطیفؒ کی ان سے ملاقات دوران سفر کھہڑا شہر سے آگے جاتے ہوئے کہیں ہوئی۔ اِس ملاقات کا ذکر سید محمد بقا شاہ نے اپنے ہونہار فرزند سید محمد راشد ''روضہ۔دھنیؒ'' سے کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سائیں ''روضہ۔دھنیؒ'' نے سب سے پہلے شاہ لطیفؒ کے کلام میں پوشیدہ عارفانہ فکر کو اپنے وعظ و نصیحت میں بیان کیا جو آپکی ملفوظات میں موجود ہیں۔

(۱۰) پیر موسن شاہ جیلانی : یہ بزرگ ''لوء مبارک'' گھونکی کے عالم، عارف اور سجادہ نشین تھے جنھوں نے ''لوء مبارک'' میں شاندار جامع مسجد تعمیر کروائی اور مدرسہ قائم کیا۔ شاہ لطیفؒ نے موسن شاہ سے اسی مسجد میں ملاقات کی تھی اور قیام فرمایا تھا۔

(۱۱) مخدوم محمد ہاشم (وفات ۱۱۷۴ھ) : جب مخدوم صاحب ''بلڑی'' کے نزدیک

بھرام پور میں رہتے تھے تو شاہ لطیفؒ کی آپ سے شناسائی ہوئی اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۱۵۳ھ۔ ۱۱۵۴ہجری تک چلتا رہا۔اِسی دورانیہ میں جب شاہ لطیفؒ نے اپنے بڑے دادا شاہ کریم "بلڑی" والے کے مزار پر جب گنبد تعمیر کرانے کا ارادہ کیا، اس کی اطلاع جب مخدوم صاحب کو ہوئی تو انہوں نے شاہ لطیفؒ کو اِس کام سے منع کیا لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے عذر پیش کیا کہ اُن کی شاہ کریمؒ سے بے انتہا محبت ہے اور مزار کی تعمیر کے ساتھ جامع مسجد بھی تعمیر ہو گی۔ اس کے بعد ملاقاتوں میں نزدیکی نہ رہی۔ لیکن اس کے باوجود شاہ لطیفؒ کو مخدوم صاحب کیلئے آخر تک عزت رہی۔ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کسی خاص مسئلے کے اہمیت کی وجہ سے جب مخدوم محمد ہاشمؒ شاہ لطیفؒ کے معتقد اور اپنے دور کے بڑے محقق و فلسفی اور ابنِ عربی کی صوفیانہ فکر کے علمبردار سالک صوفی اور وحدت الوجودی فکر کے بڑے حامی مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے پاس آنے کا ارادہ کیا اور جب مخدوم محمد ہاشمؒ، مخدوم محمد معینؒ کے پاس آئے تو شاہ لطیفؒ نے جو اس وقت اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے سے جیسے ہی مخدوم محمد ہاشمؒ کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو مخدوم محمد معین سے کہا کہ : آج مخدوم محمد ہاشمؒ سے کوئی ردّو کد نہ کرنا، کیوں کہ اُن کی پیشانی پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ ہے"۔ یہ سن کر مخدوم محمد معین نے آپ کی آؤ بھگت کی اور کہا کہ "اس مسئلے پر آپ سے ہمارا کوئی اختلاف نہیں ہے" اور پھر انہیں رخصت کرنے کیلئے دروازے تک آئے۔

(۱۲) درویش ڈاتار ڈنہ بن درویش اسحاق سکریہ (ملا کاتیار والے بزرگوں کے بڑے): اِن سے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی بڑی محبت تھی۔ جب شاہ لطیفؒ نے اپنے بڑے دادا شاہ کریمؒ بلڑی والے کے مزار اور مسجد کی تعمیر کے لیے کاشی کی اینٹیں لینے کے لیے ملتان جانے کا ارادہ کیا تو یہ بزرگ شاہ صاحب کے ساتھ ملتان گئے تھے۔ کیونکہ درویش ڈاتار ڈنہ ملتان والے بزرگوں کے خاص مرید تھے۔

(۱۳) مخدوم بھاون شاہ: ملتان کی سہروردی غوثیہ درگاہ کے سجادہ نشیں تھے۔ جن سے شاہ لطیف نے ڈاتار ڈنہ کے ذریعے ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات غالباً ۱۱۵۴ھ یا ۱۱۵۵ھ

میں ہوئی ہوگی۔

(۱۴) میاں محمد صادق نقشبندی ٹھٹوی: یہ بزرگ فارسی زبان کے بڑے ماہر، عالم اور صوفی تھے اور مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے شاگرد اور خواجہ محمد زمان لواری شریف والے کے استاد تھے۔ یہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے معتقد اور مرید ہوئے۔ انہوں نے ہی شاہ لطیفؒ کے ارشاد پر شاہ حبیبؒ کی تاریخ وفات (۱۱۴۴ھ) کا قطعہ اور میاں شاہ کریم بلڑی والے کی درگاہ کی تعمیر (سن ۱۱۵۶ھ) کا قطعہ ابجد کے حساب سے نکالا تھا۔

(۱۵) خواجہ محمد زمان (اوّل) لواری شریف والے یہ شاہ لطیفؒ کے معتقد و مرید مخدوم محمد صادق نقشبندی کے شاگرد تھے جن سے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے کچھ کی طرف جاتے ہوئے ملاقات کی تھی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے ان سے سوال کیا تھا کہ "فنا کے بعد بھی کوئی علم ہے؟" خواجہ صاحب نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا کہ "فنا سے پہلے بھلا کیا ہے؟" خواجہ صاحب کی نظر میں "شاہ صاحب ایک اہل دل عارف تھے جن کا قلبِ ذکرِ الاہی میں مشغول تھا"

(۱۶) میر (سید) محمد عطا امیر خانی ٹھٹوی (وفات ۳ شعبان ۱۱۷۸ھ) شاہ صاحب کی صحبت میں آکر اپنی تلخ عادات سے مجتنب ہوئے اور مذہبی منافرت کو ترک کر کے، باوجود شیعہ ہونے کے صاف دل صوفی بنے۔ شاہ صاحب ٹھٹے میں بسا اوقات ان کے پاس قیام کرتے تھے ۱۱۵۲ھ میں شاہ لطیف ان کے پاس قیام پذیر تھے کہ وہاں حبیب شاہ کلھوڑو نامی ایک مجذوب درویش کو سوتا ہوا پایا جس نے دوراتوں سے پہلو تبدیل نہیں کیا تھا۔ تب شاہ لطیفؒ نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا کہ: "اے درویش! تمہیں جو نیند میں حاصل ہے ہم اسے بیداری میں تلاش کر رہے ہیں، ایسی نیند تم نے کس سے سیکھی ہے؟"

(۱۷) مخدوم محمد معین ٹھٹوی: یہ اپنے دور کے بلند پایہ علماء میں سے تھے۔ یہ ٹھٹے کے بڑے عالم مخدوم عنایت اللہ اور دہلی کے بزرگ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بھی شاگرد تھے۔ تصوف میں سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ میاں ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹویؒ کے مرید

تھے۔ مخدوم محمد معین ٹھٹوی سے شاہ لطیفؒ کی بڑی گہری دوستی تھی۔ایک مرتبہ اُن سے سلسلۂ اوسیہ کے بارے میں خط لکھ کر استفسار بھی کیا تھا۔ مخدوم محمد معین سماع کے بڑے شائق تھے اور شاہ لطیفؒ کے کلام پر عاشق تھے۔ یہاں تک کہ عمر کے آخری دنوں میں شاہ کا کلام سنتے ہی ان پر حال کا اتنا غلبہ ہوا کہ اس حالت میں ان کا دَم پرواز کر گیا۔

"بھٹ" پر دائمی سکونت اور مسند رشد و ہدایت : سن ۱۱۴۲ھ میں جب شاہ لطیفؒ کی عمر ۴۰ سال ہوئی تو انہوں نے "بھٹ" پر دائمی سکونت اختیار کی دو سال بعد جب آپ کے والد شاہ حبیبؒ کی سن ۱۱۴۴ھ میں وفات ہوئی تو آپ نے موروثی مسندِ رشد و ہدایت سنبھالا۔ شاہ لطیفؒ اپنے والد شاہ حبیبؒ سے سلسلۂ قادریہ میں مندرجہ ذیل سلسلے کے تحت دستِ بیعت تھے۔

شاہ لطیفؒ کا سلسلۂ طریقت : شاہ لطیفؒ نے اپنے والد شاہ حبیب سے سلسلۂ قادریہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔حبیب اللہ شاہ نے اپنے والد عبدالقدوس شاہ سے ،انہوں نے اپنے والد جمال شاہ سے ،انہوں نے اپنے والد شاہ عبدالکریم سے ،انہوں نے اپنے مرشد سلطان ابراہیم بھارے سے ،انہوں نے اپنے مرشد سید احمد قادری حسنی حموی سے ("حما" شام کا ایک شہر ہے)انہوں نے اپنے والد سید علی ہاشمی سے ،انہوں نے اپنے والد سید شہاب الدین احمد سے ،انہوں نے اپنے والد سید شرف الدین قاسم سے ،انہوں نے اپنے والد سید بدرالدین یحیٰ سے ،انہوں نے اپنے والد سید نورالدین حسین سے ،انہوں نے اپنے والد علاؤالدین علی سے ،انہوں نے اپنے والد سید شمس الدین محمد سے ،انہوں نے اپنے والد سید سیف الدین یحیٰ سے ،(یہ حضرت پیرانِ پیرؒ کی اولاد میں سے پہلے بزرگ تھے جو بغداد سے کوچ کر کے "حما" میں آکر مقیم ہوئے تھے)انہوں نے اپنے والد سید ظہیر الدین احمد سے ،انہوں نے اپنے والد سید شمس الدین ابو نصر محمد سے ،انہوں نے اپنے والد قاضی سید ابو صالح نصر سے ، انہوں نے اپنے والد سید حافظ ابوبکر تاج الدین عبدالرزاق

سے ،انہوں نے اپنے والد شیخ الاسلام حضرت غوثِ اعظم سید محی الدین ابو محمد عبدالقادر جیلانی ؒ سے جو سلسلۂ قادریہ کے بانی مبانی تھے۔

شاہ لطیف ؒ نے گو کہ اپنے والد شاہ حبیب ؒ سے طریقۂ قادریہ میں خرقہ خلافت حاصل کیا تھا لیکن ذاتی ارادت میں انہوں نے غائبانہ رسولِ کریم ﷺ سے فیضِ رشد و ہدایت حاصل کیا تھا۔

شاہ حبیب ؒ طریقۂ قادریہ کے بڑے صاحبِ فیض بزرگ تھے اس لیے آپ کی وفات کے بعد آپ کے مریدوں نے شاہ لطیف ؒ کی طرف رجوع کیا۔ جن کی تعلیم و تربیت کے لیے شاہ لطیف ؒ نے "بھٹ" پر مستقل سکونت اختیار کی۔ اور وہاں معتقدین، مریدین و فقرآء کیلیے ایک باقاعدہ نظام مروج کیا۔ جس میں لنگر خانہ، مسجد، جماعتوں کی خدمت اور دیکھ بال اور سماع کے لیے فقرآء مقرر کیے۔

مندرجہ ذیل فقرآء ، خاص خدمتگاروں اور خلفاء کے حوالے مندرجہ ذیل کام سپرد کیے :

مائی گنگا جت، مائی صالحاں تونیہ ، مائی بونا وساں کے حوالے حویلی کی اندرونی خدمت تھی۔

عبدالواسع فقیر سالارو، سکھر فقیر ڈیرو، اسماعیل فقیر سموں بھینئ پوری، فقیر سید نہال شاہ، اسماعیل فقیر ڈیرو، اجن فقیر ڈیرو، کمال فقیر سینھڑو، ورو فقیر عرف "وگند" کاٹھڑی مکان والے نور محمد فقیر ابڑو، عمر فقیر سھتو ،مٹیاری کے فقیر سید سائیں ڈنو موسیٰ پوتو. اور پچو فقیر خاص حاظری کے فقرآء تھے۔

عمر فقیر سھتو شاہ لطیف ؒ کے خاص فقیر تھے جنہوں نے شاہ لطیف ؒ کو بچپن میں پالا پوسا تھا۔

شاہ لطیف ؒ کے بستر وغیرہ بچھانے کی خدمت سید سائیں ڈنے کے حوالے تھی۔ پچو فقیر کوزہ گیر تھے۔ عبدالجمیل فقیر انڑ کے حوالے شاہ لطیف ؒ کی تسبیح اور مصلا

رہتا تھااور نماز و عبادت کا بندوبست اس کے حوالے تھا۔

شاہ لطیفؒ کے سگے خالازاد بھائی اور بچپن کے خاص ساتھی خلیفہ محمد عالم ڈیرو، ذکر و سماع کے نگران تھے۔

سومر فقیر لاڑک ایک پہونچے ہوئے درویش تھے، جن کو شاہ لطیفؒ کی طرف سے پیری مریدی کا ارشاد ملا ہوا تھا یعنی اگر کوئی مرید ہونے کے لیے آتا تھا تو اسے سومر فقیر لاڑک کے حوالے کیا جاتا تھا۔ دوسرے فقرآء اِن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سومر فقیر لاڑک شمالی سندھ کے شہر خانپور (نزد شکارپور ؟) کے رہنے والے تھے۔

عارف فقیر تھیبو ٹنڈو الہیار (تحصیل) کے بڑے عابد شخص تھے اور نوئی فقیروں کو عبادت کی ترغیب دیتے اور نماز سکھلاتے تھے۔

عنایت فقیر وسان جت ناقہ کی زمام سنبھالتے تھے۔

رحموں فقیر بورچی تھے۔

قاسم فقیر حجام تھے اور شاہ لطیفؒ کے بال بناتے تھے۔

احمد فقیر سموں، گھلین کے رہنے والے، شاہ لطیفؒ کے گھوڑے "چنگل" کے سئیس تھے اور گھاس وغیرہ دیتے تھے۔

وٹھیون فقیر سالارانی جت، شاہ لطیفؒ کے دو کتوں، "موتی" اور "گردگان" یا "کینھون" کو سنبھالتے تھے۔

محمد رحیم فقیر شاہ صاحب کے منشی تھے اور لکھنے پڑھنے کا کام اس کے حوالے تھا۔

اس کے علاوہ راگ والے فقرآء الگ تھے جن سے شاہ لطیفؒ کو بڑی محبت تھی۔

سماع و ذکر کا سلسلہ اور راگ کا ادرہ قائم کرنا: شاہ کریمؒ بلڑی والے کی درگاہ پر ہونے والے سماع اور ذکر کے سلسلے کو ہی شاہ لطیفؒ نے بھٹ پر قائم کیا۔ سماع کا شغل رات کو عشاء کی نماز کے بعد ہوتا تھا، ہر مہینے کی پہلے پیر کی رات اور جمعرات کی رات خصوصی طور پر سماع کے لیے مقرر تھیں۔ جمع کے دن اور عیدین کی نماز کے بعد بھی سماع ہوتی تھی۔

سماع کے سلسلے میں، سر سے ابیات کہنا، ضربیں لگانا اور ذکر شامل تھا۔ سماع اور ذکر کے نگران شاہ لطیفؒ کے سگے خالہ زاد بھائی خلیفہ محمد عالم ڈیرو تھے۔ سماع کی ابتدا سردی کے موسم میں ہوئی تھی۔ لہٰذا سماع کے لیے خلیفہ محمد عالم ڈیرو پہلے آگ کا الاؤ روشن کرتے، جس کی شمال کی طرف خلیفہ اور اُس کا ساتھی کھڑے ہوتے تھے اور سامنے جنوب کی طرف تمر فقیر اور اس کے ساتھی کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے بعد شاہ صاحب آتے تھے۔ پہلے "ھو الو" کی تین تسبیحیں ہوتی تھیں اس کے بعد خلیفہ محمد عالم کے طائفہ کا فقیر بلاول یادھنا سری کے سروں میں سے ابیات دیتا تھا اور بیت کی پہلی سطر الاپنے کے بعد خلیفہ محمد عالم " اَلْقَارِعَةُ مَاالْقَارِعَة "(قرآن مجید کی سورۃ القارعہ کی ابتدائی آیات) کے ضرب لگاتا تھا۔ اس کے بعد اس کے سامنے کھڑے ہوئے تمر فقیر اور اس کے ساتھی یہی الفاظ دھرا کر دو ضربیں لگاتے تھے۔ اُسی وقت فقراء آگ کے الاؤ کے چوگرد حلقے میں آہستہ آہستہ پھیرا لگاتے۔ پھیرا اس طرح لگاتے تھے کہ سوا پھیرے میں پوری سماع ختم ہو جائے۔ آخر میں الاؤ کے مغرب کی طرف بیٹھ کر سب مل کر اجتماعی ذکر کرتے تھے۔ اور ذکر میں بھی سر سے ابیات پڑھتے۔ "یہ سماع والا ذکر" تھا۔ اس کے علاوہ روزانہ ہر نماز کے بعد "تسبیح والا ذکر" بھی ہوتا تھا۔

سماع کا طریقہ

پہلا پھیرا (پہلا چکر) مکمل	کیا پڑھتے تھے
پھیرے کے پہلے چوتھے حصے میں	سر بلاول کے چھ سے آٹھ ابیات
پھیرے کے دوسرے حصے میں	سر سری راگ کے چھ سے آٹھ ابیات
پھیرے کے تیسرے حصے میں	سر سامونڈی کے چھ سے آٹھ ابیات
پھیرے کے باقی چوتھے حصے میں	سر سورٹھ کے چھ سے آٹھ ابیات
دوسرا پھیرا (چوتھائی حصا)	
پھیرے کے پہلے چوتھے حصے میں	سر رانو اور سر حسینی کے چھ سے آٹھ ابیات

موجودہ دور میں عیدین کی نماز کے بعد سماع میں فقط تین سُروں یعنی بلاول، رانو، اور حسینی سے ابیات پڑھتے ہیں۔ ۱۴ صفر والے سماع میں چار سُروں یعنی پورب، کاموڈ، کارائل اور حسینی سے ابیات پڑھتے ہیں اور ۱۶ صفر کے سماع میں تین سُروں یعنی بلاول، رانو اور حسینی سے ابیات پڑھتے ہیں۔

اس کے بعد پھر جمعرات کو راگ کرنے کی باقاعدگی سے ابتدا ہوئی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

راگ کا ادارہ : سماع کے اس نظام میں ابیات کو سُر سے پڑھنا، اجتماعی ذکر کی صدائیں، تار میں سموئی ہوئی ضربیں لگانا اور گول حلقے میں فقرآء کے پھیرے لگانا۔ یہ وہ عناصر تھے جو بعد میں راگ کے ارتقا کے لیے بنیادی ترغیب اور علم کا سبب بنے اور اس طرح سن ۱۱۴۴ ہجری سے "شاہ جو راگ" بحیثیت ایک ادارے کے ہمیشہ کے لیے قائم ہوا۔ راگ کے لیے شاہ لطیفؒ نے مندرجہ ذیل رہنمائی مہیا کی :

۱۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے کلام میں سے کچھ ابیات اور وائیاں منتخب کیں اور اُن کو گانے کے لیے سُر مقرر کیے تاکہ درد اور محبت پیدا کرنے اور دلوں کو زندہ کیا جائے۔ آگے چل کر مزید اہتمام سے "شاہ جو راگ" سروں کے مطابق گایا گیا۔

۲۔ راگ میں جانے کے لیے "دنبورے" کا نیا ساز استعمال کیا گیا اور پہلا دنبورہ شاہ صاحبؒ نے خود ٹھٹھہ میں اپنے سامنے بنوایا۔

۳۔ راگ کرنے کیلیے باقاعدہ اوقات مقرر کیے گیے اور ان کی پوری پابندی کی گئی۔ اس طرح کہ عشا کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد راگ کی ابتدا ہوئی اور فجر کی نماز سے پہلے دعا پر راگ کا اختتام کیا جاتا۔

۴۔ راگ کرنے کیلیے گانے والے فقرآء منتخب کیے گئے اور تمر فقیر کو راگ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

اس طرح راگ شاہ صاحب کی روحانی خوراک بن چکا تھا۔ لہٰذا شاہ صاحب جب بھی کہیں باہر سفر پر جاتے تھے راگ گانے والے فقراء بھی آپ کے ساتھ جاتے اور ہر رات عشاء نماز کے بعد باقاعدگی سے راگ کی محفل ہوتی۔ سفر میں ''شاہ جو راگ'' کی آخری محفل سن ۱۱۶۱ ہجری میں ٹھٹہ شہر میں ہوئی جس کے جذبے اور اثر کے تحت مخدوم محمد معین ٹھٹوی ؒ نے وفات پائی۔

شاہ لطیفؒ روزانہ پنجگانہ نماز باجماعت اپنی تعمیر کردہ جامع مسجد میں پابندی سے ادا کرتے۔ نماز کی امامت خود نہ کرتے بلکہ مقتدی بن کر شامل ہوتے۔ حضرت شاہ عبدالکریمؒ کے طریقے کے مطابق، ذکر کی تین تسبیحیں نمازِ فجر اور دیگر نمازوں کے بعد پڑھی جاتیں۔ پہلی تسبیح میں ''اللہ ھُو'' دوسری تسبیح میں ''اللہ اللہ'' اور تیسری تسبیح میں ''ھُو ھُو'' پڑھتے تھے۔ شاہ صاحبؒ اکثر رزوہ کی حالت میں رہتے تھے۔

راگ، شاہ صاحب کے لیے روحانی خوراک تھا۔ آپکی توجہ سے ''شاہ جو راگ'' ایک اعلیٰ ادارہ بن چکا تھا۔ تمر فقیر، سید تقی فقیر، ھاشم علی فقیر ریحان پوٹا اور دوسرے آپکی رہنمائی میں راگ کرتے تھے۔ اور بالآخر راگ کی محفل کے دوران ہی آپکی روح، خالق حقیقی کے پاس جاپہونچی۔

آخری وقت میں شاہ صاحب کے ارشاد کے مطابق مسلسل تین دن تک راگ ہوتا رہا اور شاہ صاحب خود حالتِ استغراق میں مراقبے میں بیٹھے رہے اور اس حالت میں آپکی روح پرواز کر گئی۔

آپکی تاریخ وفات ۱۴ صفر سن ۱۱۶۵ ہجری ہے۔ وفات کے بعد آپکے استاد میاں نور محمد بھٹی مرحوم کے فرزند میاں ولی محمد بھٹی نے آپکو غسل دلوایا اور نماز جنازہ پڑھائی۔

فکر لطیف : مندرجہ بالا بیان شاہ لطیفؒ کی زمینی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ لیکن حقیقت میں ''شاہ جو رسالو'' اور ''شاہ جو راگ'' ہی حضرت شاہ صاحب کی سوانح

کے زندہ و جاوید ابواب ہیں۔ رسالے میں محفوظ آپکا کلام، شاہ صاحب کی اعلیٰ شاعری اور عارفانہ بصیرت پر گواہ ہے اور ہمہ وقت سندھی زبان کی دائمی دستاویز ہے گویا کہ یہ ایک الھامی کلام ہے جو کہ شاہ صاحب کی عالمگیر فکر کا مظہر ہے۔ اسلامی تعلیم اور تلقین کی روح ہے، زندگی کے مختلف مراحل اور مواقع پر انسان کے فطری جذبات اور احساسات کا عکس ہے اور اعلیٰ انسانی اخلاق و کردار کا آئینہ ہے۔

دوسری طرف "شاہ جو راگ" سندھی موسیقی کا ایک اہم تاریخی ادارہ ہے جس کی بنیاد خود شاہ صاحب نے ڈالی اور اس کی تکمیل کی۔ شاہ کی عالمگیر فکر کی روح اسلامی ہے۔ شاہ صاحب نے اسلامی تصوف اور طریقت کی روشنی میں انسان اور انسان کی عارضی زمینی زندگی سے ملحق دائمی حقائق کے بارے میں اعلیٰ فہم و بصیرت کے ابواب وا کیے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی تخلیقی فکر کے لیے مواد اپنی مٹی سے حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے کلام میں انہی قصوں اور افسانوں کے ذریعے اخلاقی تعلیم دی جو پہلے سے عوام میں معلوم اور مشہور تھے۔

شاہ صاحبؒ کی فکر اور احساسات عارفانہ ہیں۔ شاہ حقیقت میں انسان کی، نفسیاتی کیفیتوں کا فطری شارح ہے۔ شاہ کا پیغام یہ ہے کہ انسان کی زمینی زندگی کا راز اس میں ہے کہ انسان ہمیشہ کمال کی جستجو میں رہے تاکہ وہ معرفت کے مقام پر پہنچ کر ذاتِ حق کا حقیقی قرب حاصل کرے۔

جن کو پریت کا روگ لگے وہ روگ کو جانیں صحت

جن کو دردِ الفت، وہ درد سے راحت پائیں

(شاہؒ)

شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ

شاہ صاحب کے کلام میں وحدت الوجود کا مسئلہ

وحدت الوجود یا ہمہ اوست تصوف کی روح ہے۔ اکثر صوفی عارف اس اصول کے پیرو رہے ہیں لیکن اس کی تعبیر پیش کرنا انتہائی نازک مسئلہ ہے کیونکہ ذرا سی لغزش آدمی کو ملحد اور مشرک بنا دیتی ہے۔

کائنات میں کوئی بھی مفرد نہیں ہے اور نہ ہی کسی مفرد چیز کا تصور انسانی ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جب تک کسی شے کی صورت نہ ہو تب تک اس کا تصور میں آنا مشکل ہے اس لئے اگر خدا تعالیٰ کی ذات پاک کائنات کی اور چیزوں کی طرح ہوتی تو ان کی طرح ہمارے تصور کے دائرے میں آجاتی۔ یہ ایک مجرد حقیقت ہے جو ہماری عقل فہم، قیاس اور وہم سے بالاتر ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و باخبر رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصفِ تو ماندہ ایم

صوفی حضرات کہتے ہیں کہ "ذات پاک" ایک مجرد حقیقت ہے وہ ایک وجدانی اور بدیہی کیفیت ہے، روحانی کشف ہے، اندر کی آواز ہے۔ ہر چیز اس کی احدیت اور وحدانیت کی گواہی دے رہی ہے۔ "وفی کل شیئ له آیت تدل علیٰ انه واحد" اور حضرت سلطان اولیاء خواجہ محمد زمان لواری والے فرماتے ہیں کہ۔

پلپل پوءِ پچار، ملڪ م ميثاق جي
ڪک پن کن اقرار، اسين ٻانها تون ڌڻي

(عہد ازل کی گونج رہی ہے پل پل یہ آواز ہم ہیں بندے تو ہے مالک تو ئی بندہ نواز)

خالق اور مخلوق، عبد و معبود، ظاہری طور پر دو الگ چیزیں ہیں اِن میں سے کوئی بھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتی ہے۔

"انا عبد معبود تون" ات نکو شرک نہ شک
پـچارون پـرینءَ جـون محبتیـــن مـرک
ســو سپوئي حـــق، جنهن ۾ پسڻ پرين کي

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ظاہری طور پر بہت فرق ہے ان دونوں کے درمیان جو نسبت ہے وہ عقل و قیاس سے بالاتر ہے۔ اور اس کی کیفیت و کمیت ناقابل بیان ہے جیسا کہ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

اتصالی بی تکیف بی قیاس
ہست رب الناس رلبا جان ناس

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جان کو جسم سے، بصارت کو روشنی سے، خوشی کو دل سے، خوشبو کا ناک سے، نطق کو زبان سے ایک خاص تعلق ہے لیکن یہ تعلق بے چون و بے چگوں ہے۔ اس طرح خدا کو بھی ممکنات سے ایک طرح کی خاص نسبت ہے جو کہ کیفیت و کمیت سے مبرا ہے۔

انسان دوسرے حیوانات سے اس لئے منفرد ہے کہ اس میں نورِ الٰہی کا ذرہ موجود ہے جس کے طفیل وہ خدا کو پہچانتا ہے یہی چیز اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر یہ باطن شناسی اور اندرونی حس اس میں نہ ہوتی تو وہ بھی جانوروں کی طرح ہوتا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ " من عرف نفسه فقد عرف ربه" انسان عالم اصغر ہے اسی لئے اس میں عالم اکبر کی تمام خصوصیات چھوٹے پیمانے پر موجود اور متجلی ہیں۔ انسان کا دل مثلِ آئینہ ہے جس میں عالم ملکوت کے نقش و نگار دیکھے جاسکتے ہیں لیکن اِسی قسم کے اتصال یا نسبت کو اتحاد اور حلول نہیں کہا جا سکتا۔

صوفیائے کرام اور اہل ظاہر کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ

خدا تعالیٰ کائنات کے سلسلے سے الگ اور ایک بالکل مختلف (نیاری) ذات ہے۔ اور صوفیائے کرام کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات سے الگ نہیں لیکن دونوں کو علیحدہ کر کے پہنچانا نہیں جا سکتا۔

"هو" پڻ ڪونهي "هن" ريءُ هي، "هن" ٿان ڏار
الانسان سري و انا سره پروڙج پچار
ڪندا ويا تنوار، عالم عارف اهڙي

اس قدر تو تمام صوفیاء کرام متفق ہیں لیکن اِن کی تعبیر میں بڑا فرق ہے۔ چند ایک کے نزدیک اللہ تعالیٰ وجود مطلق اور ہستی مطلق کا نام ہے جو جب تعینات یا مظاہر کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو تمام ممکن اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔

سرتيون سُٽُ ڪپاهُ. مارِهو مَ منصور کي
ٿي ترڪيب تباه. وحدت وائي هڪڙي

(خواجه محمد زمان)

ساتھیو! سوت کپاس ہے، مت مارو منصور کو کثرت گم ہو جاتی ہے، وحدت کی آواز میں)

سمندر کی ہزاروں لہریں جدا جدا ہیں
لیکن حقیقتاً پانی ایک ہی ہے۔

لهرن لک لباس، پاڻيءَ وهڻ هيڪڙو
ڪوڙين ڪايائون تنهنجون. لکن لک هزار
جيءُ هر ڪنهن جيءَ سيبن. درسن ڏارو ڏار
پريم تنهن جا پار، ڪهڙا چئي ڪهڙا چوان.

(شاه عبداللطيف ڀٽائي)

مظاہر کی کثرت سے وحدت میں کوئی بھی کمی نہیں آتی یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک گرہ لگے دھاگے کی گرہیں دھاگے سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہوتیں۔ محض دھاگے کی

صورت تبدیل ہوتی ہے۔

دوسرے صوفیاء کرام وحدت الوجود کے یہ معنی لیتے ہیں کہ جیسے آدمی کا سایہ بظاہر ایک جدا شے ہے لیکن فی الواقع اس کی علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے، جو کچھ ہے فقط آدمی ہے۔اسی طرح اصل چیز باری تعالیٰ کی ذات ہے اور باقی جو چیزیں موجود ہیں وہ اس کا سایہ ہیں اس قسم کی وحدت کو وحدت الشہود (ہمہ از اُوست) کہتے ہیں۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں یہ فرق ہے کہ وحدت الوجود کے لحاظ سے سب کچھ خدا ہے اور خدا سب کچھ ہے۔ جیسے پانی کے بلبلے اور موج کو پانی بھی کہا جا سکتا ہے لیکن وحدت الشہود میں ایسا کہنا جائز نہیں کیونکہ آدمی کا سایہ ہر گز آدمی نہیں ہو سکتا۔ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" اہل ظاہر کے نزدیک وحدت الوجود نامنظور اور مردود ہے۔اس عقیدے کی وجہ سے ایران میں حلاج اور ہندوستان میں سرمد سولی چڑھ گئے لیکن بعد کے صوفیا اور متصوف عالموں نے اس کی نئی تعبیر کر کے۔اس کو اسلامی رنگ دے دیا ہے۔

وحدت الوجود کا مسئلہ کس نے اور کب شروع کیا اس کا کوئی یقینی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ زہد، عبادت، تقویٰ اور ریاضت کے زمانے کے بعد جب تصوف نے نیا رنگ اختیار کیا اور اس پر جدید افلاطونی فلسفے اور دوسری قوموں کے روحانی خیالات کا اثر ہوا تو اس طبقے کے لوگ صوفی کہلانے لگے انہوں نے تفکر اور کشف پر زیادہ زور دیا اور ان کے قلوب پر جو غیبی اطوار اور مشاہدات طاری ہوئے تو ان کو انہوں نے استغراق اور محویت کی حالت میں اچانک ظاہر کر دیا۔ یہ خیالات عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھے۔اس کے باعث کئی لوگ گمراہ ہو گئے جیسے شیخ جنید بغدادی (المتوفی ۲۹۷ھ) جنہیں سید الطائفہ یا صوفیوں کے سردار کہتے ہیں ان معتدل صوفیا میں سے تھے جو "اہل الصحو" (بیداری کے صاحب جو مدہوشی سے دور ہیں۔ اور آئیں بائیں شائیں نہ بولیں) کے نام سے مشہور ہیں۔اس کے چند اقوال سنیئے۔

ا۔ خدا تعالیٰ نے پورے تیس برس جنید سے جنید کی زبان میں باتیں کیں۔ حالانکہ نہ جنید درمیان میں تھے اور نہ عام لوگوں کو کوئی خبر تھی۔

۲۔ ایک دن میرا دل گم ہو گیا، میں نے کہا "یا اللہ میرا دل واپس لوٹا دو"۔ آواز سنی کہ "اے جنید تمہارا دل ہم نے اس لئے لیا ہے کہ تم ہمارے پاس رہو، کیا تم پسند کرو گے کہ تم غیروں کے پاس رہو؟۔"

ذیل کے اقوال وحدت الوجود کی دلالت کرتے ہیں :

۱۔ ایک رات کسی مرید کے ساتھ جا رہے تھے، راستے میں کتے کے بھونکنے کی آواز سنی اور کہا "لبیک لبیک"۔ مرید نے اس کی وجہ پوچھی تو جواب میں فرمایا کہ کتے کا زور سے بھونکنا حق تعالیٰ کی قہر و قدرت کی نشانی ہے۔ کتے کو درمیان میں نہیں دیکھا تو میں نے لبیک کہا۔

۲۔ تصوف وہ چیز ہے کہ خدا تجھے تجھ ہی سے مارے مگر زندہ خدا کرے۔

۳۔ جو شخص مشاہدے کے بغیر "اللہ" کہلوائے وہ جھوٹا ہے۔

۴۔ وجود کی معرفت علم کا حاصل ہونا عین جہل ہے۔ کہا گیا کہ اس کی وضاحت کریں۔ فرمایا "عارف اور معرف" وہی ہے۔

۵۔ جب تک تم "خدا" اور "بندہ" کہتے رہو گے تب تک شرک میں ہو۔ بلکہ عارف اور معروف ایک ہے۔ جیسے کہا گیا ہے کہ "در حقیقت وہی ہے یہاں خدا اور بندہ کہاں ہے یعنی سب خدا ہے"۔

۶۔ دو اشخاص کے درمیان محبت تب تک درست نہیں ہو گی جب تک ایک دوسرے کو یہ نہ کہے کہ اے "میں" اس دور کے اگرچہ تمام صوفی بزرگ مثلاً ذوالنون مصری (وفات ۲۴۵ھ) بایزید بسطامی (وفات ۲۶۱ھ) حلاج (وفات ۳۰۹ھ) شبلی (وفات ۳۳۴ھ) نے اپنے اپنے طرز پر صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے تاہم سب ہی کم و بیش وحدت الوجود کے عقیدے کی طرف مائل ہیں اور خدا کے علاوہ اور کوئی بھی چیز نہیں دیکھتے۔

ذوالنون مصری کیمیاوی اور فلسفی تھے جدید افلاطونی فلسفے سے بہت کچھ اقتباس کر کے تصوف سے ملا دیا ہے۔ بایزید بسطامی تو ذوالنون مصری اور جنید بغدادی سے دو قدم آگے گئے ہیں اور نہایت دلیری اور بے باکی سے وحدت الوجود کا پرچار کرتے ہیں۔ محویت

کے عالم میں اور عشق الٰہی کے نشہ میں مدہوش ہو کر ان کے منہ سے یہ اقوال صادر ہوئے ہیں۔

۱۔ " لیس فی جبتی سو اللہ "یعنی اللہ کے سوا کوئی بھی میرے جبہ میں نہیں ہے۔

۲۔ سبحانی ما اعظم شانی۔ یعنی پاکیزگی مجھے بھاتی ہے اور کتنی بڑی شان ہے میری۔

۳۔ "لا الہ الا انا فاعبدون"۔ یعنی کوئی بھی اللہ نہیں ہے دسوائے میرے میری عبادت کرو (یا مجھے پہچانو)

عبادت کے معنی معرفت یا پہچاننے کے بھی ہیں۔ جیسے فرمان الٰہی ہے "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔ یعنی نہیں پیدا کیا ہے میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں یا پہچانیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ "فیحمدنی واحمد ویعبدنی واعبدہ" یعنی وہ میری تعریف کرتا ہے اور وہ مجھے پوجتا ہے اور میں اس کو پوجتا (پہچانتا) ہوں۔

حلاج نے تو انا الحق کے نعرے کھلم کھلا لگائے جس کی وجہ سے انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا اور بانگ دہل دعویٰ کیا کہ "ان من اھوی انانحن روحان حللنا بدنا" یعنی میں وہی ہوں جس سے میں پیار کرتا ہوں اور جس سے میں پیار کرتا ہوں وہ بھی میں ہی ہوں۔ ہم دو روحیں ہیں جو کہ ایک بدن میں بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حلاج نہایت ترتیب سے خدا اور بندے کے اتحاد کے متعلق سخن گوئی کرتا ہے اور حلاج کے اقوال یہی تھے جو بعد میں ابن عربی اور دوسروں کے مدار بنے۔ اس لئے یہ دعویٰ بلکل غلط ہے کہ ابن عربی فلسفہ وحدت الوجود کے پہلے بانی تھے۔ ابن عربی نے تو اشاروں کنایوں سے کام لیا ہے۔ کبھی بھی صراحت سے وحدت الوجود کی تشریح نہیں کی۔ ورنہ وہ بھی حلاج کی طرح گردن کٹوا کے بیٹھ جاتے۔

مختصراً یہ کہ موجودہ تصوف کی بنیاد اس عہد کے صوفیوں کے ہاتھوں پڑی اور ایک محکم شکل وصورت اختیار کی البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں نئی اصلاحیں، تعبیر ورسومات اور سلوک کے احوال و مقامات شامل کئے گئے۔ امام غزالی، ابن عربی اور سہروردی

نے اس کو فلسفے کا رنگ دیا۔ امام قشیری، ابو نصر سراج، ھجویری اور غزالی نے شریعت اور تصوف کے درمیاں وفاق پیدا کیا اور یہ اصول قائم کیے کہ تصوف کے دقیق اسرار و رموز عام لوگوں کو نہیں بتائے جائیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ہے۔

سلج تنهن سلوڪ، جو ناقصيائي نگئو

يا

حـوصلو حيـرت جو يا. آه نه مٿي عام

سنڌي محبت مام. ڪور پروڙي ڪين ڪي

مولانا رومی ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "انا الحق" کا نعرہ حلاج کی نہایت انکساری اور کسر نفسی کا ثبوت ہے کیونکہ جس نے کہا "انا العبد" (میں بندہ ہوں) اس نے گویا اپنی خودی کو ظاہر کیا اور خدا سے شرکت کی۔ اس طرح حلاج نے اپنی دوئی کو ختم کیا۔ اور خدا تعالیٰ کی ذات میں اپنے آپ کو اس قدر گم کیا کہ اس کے سوا اسے اور کچھ بھی دکھائی نہ دینے لگا۔ فریدالدین عطار جو حلاج کے شیدائی ہیں فرماتے ہیں کہ 'قم باذنی' اور 'قم باذن اللہ' دونوں محبوب کی زبان سے نکلے ہیں اور جو انا الحق کا نعرہ نہیں لگائے گا وہ کافروں کی جماعت میں سے ہے۔

قم باذنی قم باذن اللہ

ہر دو یک نغمہ آمد از لبِ یار

ہر کہ از وی نزد انا الحق سر

او بود از جماعتِ کفار

اور محمود شبتری کہتے ہیں کہ اگر جلتا ہوا پودا "انا الحق" کہے تو یہ ٹھیک ہے اور اگر ایک نیک مرد "انا الحق" کا نعرہ لگائے تو کیوں روا نہیں؟۔

روا باشد از درختی

چرا نبود روا ز نیک بختی

اور شاہ عبد لطیف بھٹائی نے اس نکتہ وحدت کو بڑے احسن طریقے سے آشکار کیا ہے۔

جرتڙ تک تنوار، وحدت وائي هيڪڙي
سيئي شي ء ٿيا. سوريءَ سزاوار،
همہ منصور هزار، ڪُهي ڪهندي ڪيترا.

لیکن اس سرمدی نغمہ کو سننے کے لئے دوسرے کان چاہئیں صرف اہل دل ہی اس معنی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ رومی فرماتے ہیں

جملئہ ذرات عالم در نہان
با تو میگویند روزان و شبان
ما سمیعیم و بصیریم و خوشیم
با شمانا محرماں ماخامیم !!
نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گل
ہست محسوس حواس اہل دل

سندھ میں تصوف اپنی کامل صورت اور پورے جلوے کے ساتھ نمودار ہوا۔ سندھ کی پاک زمین پہلے سے ہی صالح تھی۔ سندھ کے تمام صوفی بزرگوں اور رومانی شاعروں نے وحدت الوجود کے نغمے گائے ہیں اور آسمان سخن پر ان کا غلغلہ سننے میں آتا ہے۔ سندھ کے حکمران بھی دینی رواداری اور مصلحت کے حامی تھے اور کسی بھی حق گو کو ناحق نہیں ستایا۔ ہمارے پہلے عارف اور شاعر قاضی قاضن (وفات ۹۵۸ھ) وجودی تھے اور شاہ کریم (وفات ۱۰۳۲ھ) وجودی تھے اور شہودی بھی قاضی قاضن نے کہا ہے کہ

"لا" لاهيندي ڪن ڪي، "لا" مورانهين ناهه
بالله ريءَ پريان، ڪت نہ ڏسجي ڪو بيو

شاہ کریم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

"لا" مَرلــــوڏي ڪــڍ "اِلا" ۾ لاھلـــڪ ســـين

جو مظھر سندو ماڙوئين، تي ڪيئن ڪرين وڍ

اور قاضی قاضن بے خودی کے عالم میں فرماتے ہیں۔

ســائر ڏيئي لــت، اوچي نيچي ٻوڙي

ھيڪائي ھيڪ ٿيو، ويئي سڀ جھت

نشیب و فراز یکساں کردئے، کسی چیز کا وجود باقی نہیں رہا اور سب جہات مٹ گئیں۔ شاہ کریم نے اس کے مقابلے میں ایک باریک نکتہ یوں بیان کیا ہے۔

سائر ڏي نه لت، اوچي نيچي سيڪھين

نابــودي نه ٿيئـــي، اي ناديــدي جھـــت

اس کی مثال اس سبزہ کی مانند ہے جو زمین پر اگ آتا ہے اور اچانک دریا زمین پر غالب ہو جاتا ہے اور سبزہ کو ڈبو کر اس طرح ناپید کر دیتا ہے کہ دیکھنے والے کو کچھ نظر نہیں آتا حقیقتاً اس کو نابود نہیں کہہ سکتے۔ وہ بدستور ایک ہستی ہے لیکن وہ دریائے کے غلبے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

اس طرح رومی نے پھر آگ اور لوہے کی مثال دی ہے اور قاضی قاضن کی طرح مغالطے کا شکار ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ لوہا سرخ ہو کر آگ کے ہم رنگ ہو جاتا ہے اگرچہ وہ حقیقتاً آگ نہیں ہوتا اس میں آگ کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ لوہا آگ ہو گیا ہے۔ "فنافی اللہ" کے مقام پر انسان کی بھی یہی حالت ہو جاتی ہے۔

رنگ آہن محو رنگ آتش است

ز آتشی میلا ندو خامش وش است

چون بہ سرخی گشت ہمچوز رکان!

بس "انا النار" است لافش بے زبان

شدز رنگ طبع آتش محتشم!
گوید او "من آتشم من آتشم"
آتشم من، گر تراشک است وظن
آزموں کن دست رابر من بزن
آدمی چوں نور گیرد از خدا
ہست مسجود ملائک ز اجتبا

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوہے کا وجود آگ میں گم ہوگیا۔ اس کا وجود تو باقی ہے البتہ اس میں صرف آگ کی چند خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح "فنافی اللہ" ہونے سے آدمی بلکل خدا نہیں ہو جاتا جیسے فرید الدین عطارر فرماتے ہیں:

تواز دریا جدائی و عجب بین
نہ ز تو یک لحظہ این دریا جدا نیست
خیال کج مکنؔ انجا و بشناس
کہ ہر کو در خدا گم شد خدا نیست

حقیقتاً اولیاء اللہ کبھی بھی ایسی استغراقی حالت میں نہیں ہوتے تھے جو حقوق اللہ سے غافل رہتے۔ وہ خدا تعالیٰ کے زیر سایہ ہوتے تھے جب وہ حالت استغراق میں ہوتے تھے تو نماز کے وقت خو بخود بیدار ہو جاتے تھے اور تادم مرگ احکام شریعت کی پابندی کرتے تھے۔ کچھ نابکار صوفی کہتے ہیں کہ فنافی اللہ کی حالت میں وہ تمام دینی فرائض سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں خود حلاج آخری دم تک نماز میں مصروف رہے وہ تو کہتے ہیں کہ حضور قلب حاصل کر کے خود کو گم کرنے کے بعد تکبیر کہو۔

جان جان پسين پاڻ کي، تان تان ناه نماز
سڀ وڃائي ساز، تهان پوء تکبير چئو

قاضی قاضن سے ٹکراؤ کے باوجود شاہ کریم صریحاً وجودی تھے۔ جیسا کہ آپ کے

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مروئان موران. پکڻان وئي ٻي مَر پُل
هــوُ هُلا چو هُل. بِا الله سندو سڄڻين

☆

سوئي هيڏ انهن. سوئي هوڏانهن سوئي من وسي
تــيهين سنــدي ســوجهري. ســوئي ســوپســي

☆

پاڻئي سلطان . پاڻئي ڏي سنيهــڙا
پاڻ ڪرپاڻ لهي. پاڻ سڄائي پاڻ

☆

اسين سڪون جن ڪي،تان سي اسين پاڻ
هاڻــي وچ گمان. ســهي سڃاتا سپــريــن

لطف اللہ قادری جو شاہ کریم کے ہم عصر اور شاہ لطیف سے پہلے ہو گزرے ہیں "اسم ذاتی" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

چيائــون الله . هــادي جــو حــق
اوپاڻان ويا پــيــڙا. تــيــن ذات مــطلق
فــلاهــم الا انا ات نہ ڪــو شبہ نہ شـــڪ
حاصل جنين حق. سي واصل ٿيا وصال ۾

میاں عیسیٰ جو شاہ لطیف سے عمر میں بڑے لیکن ہم عصر تھے ایک متشرع عالم وعامل گزرے ہیں۔ وہ وحدت الوجود کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جي پاڻ نہ پسين پرينءَ کي. تہ تون پسي صحيح سڄڻ
ان الله بصيــراً بالعباد. اي حــرف هينئين ســن هــڻ
پَــرِورَ ڪــي پســـڻ. آهــي ســيــڪنهــن شــيءِ جـــو.

پسين جي پر ڪنهين، نه سڄڻ توهين ساڻ،
وهو منڪم اين ماڪنتم، اي عيسيٰ سڻ اهڃاڻ،
نوڙت ۽ نياز سين، جي صحيح سڃاڻين پاڻ
نه معرفت مهراڻ، منجهان تو موج هٽي.

☆

اڌمي اندر ڪان، جو موج هڻئي مهراڻ،
نه علائقا هن عالم جا، ويندءِ پاڻئون آڻ
بلڪ پيهي ويندين پاڻ، پريند هم ان پاتارم.

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی (وفات ۱۰۷۵ھ) اگر چہ ایک فقیہ تھے۔ اور ظاہری شریعت کے پابند تھے اور شاید اسی وجہ سے سلطان الاولیا خواجہ محمد زمان، شاہ لطیف اور مخدوم محمد معین سے ان کی نہیں بنتی تھی، ایک بڑے صوفیؒ اور روحانی بزرگ تھے جو کہ ان کی تصنیف "قوت العاشقین" سے ظاہر ہے۔ لیکن آپ شہودی تھے اور دین متین پر راسخ تھے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ جان بوجھ کر وحدت الوجود کے بھنور میں آجائیں کیونکہ عام لوگوں کی رہبری کے لئے شریعت بلکل کافی اور شافی ہے۔ اس لئے لوگوں کو ماوراء الحیات کے مسائل میں نہیں الجھانا چاہئے۔

حوصلو حيرت ۾، ڪري ڪونه درڪ،
جو حسن سندو حق سو ڪورپروڙي ڪين ڪي.

حافظ فرماتے ہیں کہ:

میانِ عاشق و معشوق، ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی، حافظ ازمیان برخیز

نہ صرف یہ بلکہ حجاب کے پردے کو ہٹانے کا خیال کرنا بھی حجاب ہے اس لئے اس کو بھی بھلادو اسی طرح عشق کا خیال کرنا بھی عاشق اور معشوق کے درمیان حجاب ہے۔

رومیؔ فرماتے ہیں کہ :

تو ہر خیال کہ کشف حجاب پنداری
بینگنش کہ تیرا خود ہماں حجاب شود

شاہ لطیف اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں :

عيــن شــرڪ اِيءُ، جيئن بي شــرڪ پائين پاڻڪي،
وجائــي وجــود ڪــي، پاڻان پاســـي تــسيءُ
هيڏانهن ڪونهي "هيءُ"، "هو" پڻ ڪونهي "هن" ري۽

شاہ صاحب محض وجودی تھے لیکن آپ نے وحدت الوجود کے نظریے کو ایسے احسن پیرائے میں بیان کیا ہے کہ کوئی بھی اہل ظاہر اس پر اعتراض نہیں کر سکتا وہ دور ہی وحدت الوجودی خیالات کا تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کا بھی وہی عہد تھا۔ وہ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اور انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امام ربانی کے "وحدت الشہود" اور "وحدت الوجود" کے درمیان کوئی معقول فرق نہیں ہے بلکہ صرف الفاظ کا ردوبدل ہے۔ اسی خیال کو شیخ عبدالرحیم گرہوڑی نے خواجہ محمد زمان کی درجہ ذیل بیت کی تشریح کرتے ہوئے ظاہر کیا ہے۔

صــورت معنيٰ وچ ۾، ڪونهي وچ وچان،
هونہ سچاپي هن ري، هي مورنہ موجودا،
ڪــٿي جــوهر ڪــونجي ڪٿي عرض آ،
حقيقــت هيڪاه، پــر نالن مٿــو ناه ڪــو.

ظاہر اور باطن والے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مظہر خود ظاہر ہے اور بعض حضرات مثلاً امام ربانی صاحب فرماتے ہیں کہ مظہر خود ظاہر (خدا) نہیں ہے حقیقت خواہ شریعت کے لحاظ سے دونوں قول برابر ہیں۔ لیکن چونکہ امام ربانی صاحب شریعت تھے۔ اسی لئے شریعت

کو ترجیح دی ہے۔ ورنہ حقیقتاً کثرت کوئی چیز نہیں۔

"ولی اللّٰہی فلسفے" کا اثر سندھی شعراء مثلاً شاہ عبداللطیف پر جو شاہ ولی اللہ سے ۱۲ برس پہلے ہوئے اور ۱۱ برس پہلے انتقال کر گئے۔ کس قدر ہوا، اس پر ابھی تحقیق ہونی ہے البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مخدوم محمد معین اور بعض دوسرے شعراء اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ شاہ لطیف نے وحدت الوجود کے مسئلہ میں اپنے پر دادا شاہ کریم کی پیروی کی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

پاڻ ئـي پسـي پاڻ کي، پاڻ ئي محبوب.
پاڻ ئي خلقي خوب، پاڻ ئي طالب تن جو.

☆

پاڻ ئي جل جلاله، پاڻ ئي جان جمال
پاڻ ئي صورت پرجي، پاڻ ئي حسن ڪمال
پاڻ ئي پير مريد ٿـئي پاڻ ئي پاڻ خيال
سڀ سڃوئي حال، منجهان ئي معلوم ٿي

☆

وحدت تان ڪثرت ٿي ڪثرت وحدت ڪل
حـق حقيقي هيڪـڙو، وائـي ٻـي مَ ڀُل
هــي هُلا چــو هُل، بِالله سندو سجڻين

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وحدت سے کثرت کیسے پیدا ہوئی اور کثرت کیسے وحدت ہے؟ جامی نے "یوسف زلیخا" میں فرمایا ہے کہ اوائل میں جب وقت کی ابتدا ہی نہیں ہوئی، خداوند تعالیٰ کی ہستی مطلق جو تمام صفات اور قیود سے آزاد تھی اس نے اپنے جمال مطلق کا جلوہ خود اپنی ذات پر کیا۔ اپنی صورت میں پیش کیا۔ لیکن جس طرح کوئی حسین چار دیواری میں چھپ نہیں سکتا اور دروازے بند کرتے ہوئے کھڑکی سے جھانکتا ہے۔ اسی

طرح اس مطلق جمال میں بھی جنبش ہوئی کہ خود کو عیاں کروں اسی لئے کائنات کا سارا نظام قائم کیا اور بالآخر انسان کو پیدا کیا جس میں شناسائی کی قوت و دیعت کی ہوئی تھی۔ اللہ نے فرمایہ کہ "کنت کنزاً مخفیًا فا حببت ان اعرف فخلقت الخلق لکی اعرف" یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا چاہت ہوئی کہ پہچانا جاؤں اس لئیے پیدا کیا خلق کو کہ پہچانا جاؤں۔ شاہ صاحب نے اس خیال کو مختصراً اس طرح بیان کیا ہے:

پيس اي پرياڻ. نہ ڪريان پاڻ پڌرو.
نڪو ڳولي تڪيو. نڪي ڳولي پاڻ.
خالقَ خلقَي خَلق کي. باريءَ ڪيو بيان.
چئي "ڪن فيڪون" کي جوڙيائين جهان.
سج چنڊ تارا ڪتيون. ارض آسمان.
ساراهي سبحان. پوءِ مڙني محمد مڃيو.

عام اعتقاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت محمد کے نور کو پیدا کیا۔ جس سے باقی تمام کائنات پیدا ہوئی۔ یہ ایک تفصیل طلب بات ہے۔ یہاں صرف اشارے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ یہ بیان "ہمہ اوست" کے فلسفے کے مطابق ہے لیکن اس سے بھی وہ معنی لئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کچھ ہے وہ اس کی طرف سے ہے، اسی سے ہے اور اسی میں سے صدور ہوا ہے، اس سے صوفیا کرام نے تعینات اور تنزلات کا نظریہ قائم کیا ہے۔ جو درحقیقت جدید افلاطونی فلسفے کا خاص جز ہے اور اسلامی نظریہ کے منافی ہے۔ دوم یہ کہ جو کچھ ہے اسی سے ہے اور اس پر ہی مدار رکھتا ہے۔ تمام چیزیں عارضی اور فانی ہیں اور باقی صرف خدا پاک کی ذات کو بقا ہے۔ یہ مراد آیت قرآنی "کل من عنداللہ" کے مطابق ہے۔

بعض صوفی شعرا نے ایک بات پر زور دیا ہے تو دوسروں نے دوسری بات کی تائید کی ہے۔ اس معاملے میں فریدالدین عطآر کافی دور چلے گئے ہیں اور اس کے کلام کی جھلک سچل فقیر اور ان کے سالکوں بیدلؔ اور بیکسؔ کے اشعار میں بھی ملتی ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا خود آدم کی

صورت اختیار کر کے مختلف رنگ و روپ میں انسان کی ہدایت کے لئے اوتارین کر آیا ہے۔

یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ عطاؔر کے مندرجہ ذیل قطعہ پر غور کیجئے۔

ای روی درکشیدہ بازار آمدہ
خلقی بدان طلسم گرفتار آمدہ
غیر تو ہر ہست سراب و نمائش
کانجانہ اندک است و نہ بسیار آمدہ
آنجا حلول کفر بود اتحاد ہم
این وحدت است لیک تبحرار آمدہ
یک عین متفق کہ جزاوذرہ ای نبود
چوں گشت ظاہر ایں ہمہ انوار آمدہ
گوہر دوکون موج برآرند صد ہزار
جملہ یکی است لیک بصد بار آمدہ

کثرت حقیقت میں وحدت ہے جو بار بار اپنے آپ کو دہراتی رہی ہے۔ سمندر سے لاکھوں لہریں ابھرتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ سب ایک ہی لہر (موج) ہے جو بار بار آتی رہتی ہے۔ سینکڑوں سیب اور آبیوں دیکھنے میں الگ الگ ہیں مگر ان سب کو اگر نچوڑا جائے تو ان کی رس ایک ہی طرح کی ہوگی، جیسے رومیؒ نے کہا ہے :

گر تو صد سیب و صد آبی بشمری
جملہ یک گروچہ آنرا بفشری
درمعانی تجزیہ افراد نیست

شاہ لطیف نے اس خیال کو لطیف انداز سے اس طرح ادا کیا ہے :

سو پڙاڏو، سو سڏ، ور وائيءَ جو جي لهين.

هٺا اڳـهين گـڏ ، پـر پـڏڻ ۾ به تيا.

ڪثرت کسی چیز کا نام نہیں وحدت اندرو حدت ہے۔ عارف اور معروف عاشق اور معشوق دونوں ایک ہیں بلکہ۔

جملہ معشوقست وعاشق پردہ ای
زندہ معشوقست و عاشق مردہ ای

جیسے ابن عربی فرماتے ہیں :

تو همت قد ماقبل ان يكشف الغطا
اخالي كاني ذاكرلك شاكر
فلما تجلى الصبح اصبحت عارفا
بانك مذكورو ذكرو ذاكر

یعنی پردہ اٹھنے سے قبل میں یہ سمجھتا تھا کہ میں تیرا ذکر اور شکر کرنے والا ہوں لیکن جب بھید کھلا تو معلوم ہوا کہ تو ہی مذکور ذکر اور ذاکر ہے۔

سرو، ساغر اور ساقی تینوں ایک ہیں ساجڑ، سوہنی اور سائڑ تینوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔

سـوساهـڙ، ساسهڻي، سائرپـڻ سـوئي،
آهـي نـجوئي، ڳجھ انـدر ڳالهـڙي.

ہر چیز پنہوں ہے۔ سسی اور تکالیف عارضی اور لابقا ہیں۔

پـيهي جان پاڻ ۾، ڪـيـم روح رهاڻ،
نه نڪو ڏونگر ڏيھ ۾ نڪا ڪيچين ڪاڻ،
پنهون ٿيـس پاڻ، سسئـي تان سور هٺا .

یہ سب آپس میں مل کر بین کرتے رہے وہ آپ ہی ہے جو محبوب کے سامنے گھوم رہا ہے۔

سـوپـکـي، سـوپـيـرو، سـومـر، سـوئي هنجھ.

پيھي جان پروڙيو، مون پنھنجو منجھ.
نہ ڏيل جنھن جو ڏنجھ، سوماري پيو منجھ ڦري.

حاصل کلام یہ ہے کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحث کافی طویل ہے۔ الفنا فی اللہ انسان کی روحانی ترقی کا فقط پہلا قدم اور البقاء باللہ کا پیش خیمہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات بے ابتداء بے انتہا ہے ویسی ہی انسانی روح کی ترقی بھی لاانتہا ہے۔ مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں لبوں پر مہر خاموشی ہے۔

نکا ابتدا عبد جي، نکا انتھا.
جن سجاتو سپرين، سي وڃڻ کي ويا.

ان دیکھے اشجار ہیں ہر سو، صحرا، پریت، پیاس،
دل دہلاتے دشت و جبل اور من میں ہے خوف و ہراس
آگ اگلتا سورج میرا، جھلس رہا ہے ماس
پریتم آجا پاس، تنہا ہوں میں ویرانوں میں
(شاہؒ)

مولانا غلام رسول مہر

احوال شاہ عبداللطیف رح

ہندوستان میں اسلام کے ظہور کے بعد پہلے عربی زبان نے فروغ پایا، پھر فارسی زبان کو عمومیت کا خلعت ملا۔ عربی چونکہ دینی علوم کا سرچشمہ تھی۔ اور اسلام کے اصل ماخذ عربی ہی میں تھے، اس لئے سندھیوں نے عربی زبان اور عربی علوم میں وہ پایہ حاصل کیا کہ مدینہ منورہ میں انہوں نے درس و تدریس کی سندیں آراستہ کیں اور عالم اسلام کے اکابر جواہر فیوض کے لئے ان کے سامنے عقیدت سے دامن پھیلاتے رہے۔ جو کتابیں سندھ میں تصنیف ہوئیں۔ وہ مدتوں اہل علم کے استفادہ کا مرجع رہیں یہاں کی درسگاہوں میں بھی عربی کی تعلیم اس پیمانے پر دی جاتی تھی کہ شاید عرب میں بھی ویسی درسگاہیں زیادہ تعداد میں موجود نہ تھیں۔ پھر فارسی یہاں کی عام علمی زبان بنی تو نظم و نثر کے اشخاص کے احوال و سوانح مرتب ہوئے جنہیں وقت کی ان علمی زبانوں میں قابلِ ذکر درجات حاصل ہوئے۔

سندھی زبان میں بہ ظاہر بہت کم اصحاب نے اظہار خیال کیا۔ چونکہ اسے عام طور پر علمی درجہ حاصل نہ تھا اور یہ محض بول چال تک محدود تھی۔ اس لئے یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ سندھی میں نظم و نثر نگاروں کے حالات ترتیب نہ پاسکے۔ کلھوڑوں کے دور سے ذرا پہلے سید عبدالکریمؒ ایک بزرگ ہوئے، جو سندھی زبان میں شعر کہتے تھے۔ غالبًا مخدوم نوحؒ سے شعروں میں سوال و جواب ہوتے تھے۔ میر علی شیر قانع نے علی شیرازی کے بیان میں لکھا ہے:

میاں سید عبدالکریم صاحب بلڑیؒ بیتے

درزبان سندھی بہ طریق معما جناب استاد

خود مخدوم نوحؒ ہالہ کنڈی فرستادند تا جواب
فرمانید۔ ہرگاہ سوال و جواب بنظر میر معزالیہ
در آمد مضمون ہر دو بیت درین یک بیت پارسی
بستہ تشفیٔ خاطر طرفین فرمودند۔

جان بجانان وہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل این کو
یا آن کو (ح ا)

میاں سید عبدالکریم صاحب بلڑی والے نے
سندھی زبان میں ایک بیت معمے کے طور پر
اپنے استاد مخدوم نوح ہالہ کنڈی کے پاس بھیجی
تھی کہ اسکا جواب ارشاد فرمائیں
میر علی شیرازیؒ نے سوال و جواب دیکھے تو
دونوں بیتوں (سید عبدالکریم کی بیت اور
مخدوم نوح کی بیت) کا مضمون فارسی میں ایک
شعر میں باندھ کر دونون کو مطمئن کر دیا۔
بیت یہ تھی:

اے دل تو جان خود محبوب کے حوالے
کر دے، ورنہ موت اسے لے جائے گی۔
تو خود انصاف کر کہ آیا یہ صورت اچھی ہے یا وہ
صورت؟

غرض سندھی زبان کی طرف اعتناء بہت کم تھا۔ اتنا کم کہ کتابوں میں اس زبان کے شعرا کے حالات تک مدون نہ ہو سکے۔ لیکن کلہوڑوں کے دور میں عبداللطیفؒ پیدا ہوئے۔

ا۔ "مقالات الشعرآء" ص۔ ۲۱۰

جن کا پورا کلام سندھی زبان میں ہے اور نہ محض سندھی میں بلکہ کسی زبان میں بھی سندھ نے شاہ صاحب جیسا حقائق گو شاعر آج تک پیدا نہ کیا اور وہ دنیا کے ان چند شعرا میں سے ہیں جن کی حیثیت بہ اعتبار حقائق و معارف عالمگیر ہے اور جن کے کلام میں تداول ایام سے کوئی کہنگی اور فرسودگی پیدا نہیں ہو سکتی جیسے انگریزی زبان میں شیکسپئر، جرمن زبان میں گوئٹے، اردو زبان میں غالب اور اقبال، فارسی زبان میں سعدی، حافظ، مولانا روم، نظیری، عرفی وغیرہ، سنسکرت زبان میں کالی داس، پنجابی زبان میں وارث شاہ اور بُلّے شاہ عربی زبان میں امرا ٔالقیس، متنبی وغیرہ۔ سارلے نے بلکل درست لکھا کہ شاہ صاحب کلہوڑوں کے دور کا درخشاں ترین رتن تھے۔(ح ۲)

شاہ عبدالطیفؒ کی سوانح کا کوئی قابلِ اطمینان خاکہ اب تک مرتب نہ ہو سکا اور ان کے گرد و پیش افسانوں کے کئی ہالے تیار کر دیے گئے جہاں معلومات کی قلت اور عقیدت کی فراوانی ہو، وہاں عموماً اس قسم کی صورت پیش آتی ہے۔

شاہ صاحب کے متعلق اس روایت کو عام طور پر مستند مانا جاتا ہے، کہ وہ ۱۱۰۱ھ (۹۰۔۱۶۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ گویا ان کی ولادت بارہویں صدی ہجری کے عین آغاز میں ہوئی عوام کے عقیدے کے مطابق صدی کے عین آخر پر مجدد پیدا ہوتے ہیں شاہ عبداللطیف کو کوئی شخص بہ اصطلاح معروف، مجدد، مانے یا نہ مانے انہوں نے اپنی شاعری سے سندھی زبان کو زندہ کر دیا۔ اس زبان میں وہ دل آویزی اور وہ روحِ جاذبیت پیدا کر دی کہ آج بڑے بڑے اہلِ علم صرف شاہ صاحب کی شاعری سے محظوظ ہونے کے لئے سندھی زبان سیکھتے ہیں۔ پھر ان کی تعلیم اربابِ معرفت کی تعلیم تھی، جو اپنی ہمہ گیری کے باعث زمان و مکان کی قیود سے بالا ہوتی ہے۔ جس کے مخاطب ہر عہد، ہر دور، ہر ملک اور ہر قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ ان کی زبان پر جو کچھ جاری ہوتا ہے، وہ انسانیت کا درس ہوتا ہے، آفاقیت کا وعظ ہوتا ہے، وہ مردم گری کے سانچے تیار کرتے ہیں، انسانوں کو بہتر انسان بناتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق انہیں فرائض کو پورا کرنے کو شوق اور ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔ جن کے لئے خدا

۲۔ "شاہ عبداللطیف" ص۔۱۶۹

پیغمبروں کو دنیا میں بھیجتا ہے۔

جس حد تک خاندانی عظمت و رفعت کا تعلق ہے شاہ صاحب کا گھرانا سندھ میں سب سے اونچا نہ تھا تو کم از کم دو تین اونچے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ عوام کو اس گھرانے اور اس کے افراد سے جو سچی عقیدت تھی، وہ بادشاہوں اور فرمانرواوں کو بھی شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سارلے نے لکھا ہے:

> خود شاہ صاحب نے گھرانے کی اس بلند حیثیت سے ناواجب فائدہ اٹھانے کو کبھی پسند نہ کیا۔ انہوں نے ان راحتوں اور نفاستوں کو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جو دنیا داروں کی خواہشات کا مرجع ہوتی ہیں۔ (ح ۳)

شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ حبیبؒ کے متعلق "تحفۃ الکرام" کا بیان ہے کہ وہ صاحبِ وجد و حال تھے۔ استغراق کا یہ حال تھا کہ ان کے فرزند شاہ عبداللطیفؒ حاضر ہوتے تو اکثر پوچھتے: کون ہے؟ شاہ صاحب عرض کرتے "آپ کا غلام عبداللطیف ہے" شاہ حبیب فرماتے: "میں نے نہیں سنا۔"

مقالات الشعراء میں بہ سلسلۂ حالات میاں محمد صادق نقشبندی مرقوم ہے:

> در فوت والد بزرگوار آن سر آمد اولیا (شاہ عبداللطیف) المسمی بہ میر حبیب اللہ کہ ہما نام ذات اقدسش ناموس سلسلۂ کریمیہ و بہ کرامات ظاہرہ اظہر من الشمس چنین تاریخ از حدیثِ نبوی استنباط کردہ:
>
> ۱۱۴۴ھ
>
> الموت جسر یوصل الحبیب للقا الحبیب (ح ۴)

۳۔ "شاہ عبداللطیف"، ص۔ ۱۷۲

۴۔ "مقالات الشعرآء"، ص۔ ۱۷۳

شاہ عبداللطیفؒ سر آمد اولیا تھے۔ ان کے والد،
میر حبیب اللہ، سید عبدالکریمؒ کے سلسلے کی
آبرو تھے اور ان کی کرامتیں سورج سے زیادہ
روشن ہیں۔ ان کی وفات کی تاریخ میاں محمد
صادق نقشبندی نے رسول کریم ﷺ کی اس
حدیث سے نکالی تھی:
موت ایک پل ہے، جس سے گزر کر دوست،
دوست کے لقا سے شرف پاتا ہے۔

گویا شاہ حبیب کی وفات ۱۷۳۱ء میں میاں نور محمد خان کے عہد حکومت میں ہوئی اور شاہ عبداللطیف کی عمر اس وقت کم و بیش چوالیس سال کی تھی۔

شاہ عبداللطیف کا لڑکپن ہالہ حویلی میں بسر ہوا، پھر شاہ حبیب پاس کے ایک موضع کوٹری میں منتقل ہو گئے۔ غالباً والد کی وفات کے بعد شاہ عبداللطیف نے خود ریت کے ایک ٹیلے پر نئے موضع کی بنیاد رکھی جو بھٹ (ریت کا ٹیلہ) کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ موضع کراڑ جھیل کے قریب تھا، جس میں نہر علی گنج سے پانی آتا ہے، یہیں اپنی زندگی گزاری۔ اسی کی خاک میں وہ آخری نیند سوئے۔ شاہ صاحب ہی کی وجہ سے بھٹ کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ دیکھیے بادشاہوں نے بڑے بڑے قلعے شہر اور مقبرے بنائے جن پر لاکھوں کروڑوں روپے صرف ہوئے، لیکن بھٹ ایک تودۂ ریگ تھا، انسانیت کے ایک گوہر درخشاں نے جس کا نام شاہ عبداللطیف تھا اس تودۂ ریگ کو ایسی شہرت دے دی کہ جب تک دنیا باقی ہے۔ اس کا نام زندہ رہے گا۔ سندھ کے طول و عرض میں تاریخی عہد کے آغاز سے اب تک بیسیوں شہر آباد ہوئے جن میں سے اکثر کے نام صرف صفحات تاریخ پر باقی رہ گئے ہیں لیکن بھٹ کے فروغ و آرائش کا اصلی دور اب شروع ہوا ہے جب کہ شاہ عبداللطیف کے عارفانہ کلام کا صحیح ذوق پیدا ہوا اور یہ فروغ انشاء اللہ ترقی ذوق کے ساتھ ساتھ بہ دستور روزافزوں

۴۔ "مقالات الشعراء" ص۔ ۱۷۳

رہے گا۔

شاہ عبداللطیف کا ایک عزیز دوست میرزا مغل بیگ تھا، وہ ۱۷۱۳ء میں قزاقوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ شاہ صاحب نے اسی کی صاحبزادی سے نکاح کر لیا۔ بچہ کوئی نہ ہوا۔ ایک افسانہ مشہور ہے کہ شاہ صاحب کی اہلیہ جب حاملہ تھیں تو ایک خاص قسم کی مچھلی (پلا) کھانے کی آرزو کی۔ ملازمہ نے شاہ صاحب کے ایک مرید کو وہ مچھلی لانے کے لئے بھیج دیا۔ جب انہیں یہ واقعہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ جو بچہ رحم مادر میں میرے درویشوں کے لئے اس درجہ باعثِ اذیت بنا ہے، وہ جوان ہو کر خدا جانے کیا گل کھلائے۔ خدا کرے کہ یہ کلی کھلے بغیر مرجھا جائے۔ چناچہ بچہ مردہ پیدا ہوا۔ (ح۵)

یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کے افسانے شاہ صاحب کی کرامت کا ثبوت تو بن سکتے ہیں لیکن ان کی عالمگیر شفقت و محبت کا کوئی اچھا مظاہرہ نہیں ہیں اور انہیں درست ماننا مشکل ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کتابی علم سے بے نیاز تھے۔ "تحفۃ الکرام" کا بیان ہے :

باآنکہ امی بود، حق تعالیٰ تمام علوم بر
لوح سینہ اش مثبت داشتہ (ح۶)

اگرچہ وہ ان پڑھ تھے، لیکن خدا نے تمام علوم ان کے سینے کی تختی پر لکھ دیئے تھے۔

ڈاکٹر سارلے نے لکھا ہے :

شاہ صاحب کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ
انہیں عربی فارسی سے ایسی آگاہی حاصل تھی
جو اس زمانے کی عام خواندگی سے بہت زیادہ
تھی۔ یہ امر یقینی ہے کہ وہ مثنوی مولانا رومؒ

۵۔ "شاہ عبداللطیف" ص ۱۷۵۔۱۷۶
۶۔ "تحفۃ الکرام" جلد سوم۔ ص ۱۵۲

بجو بی جانتے تھے، بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ میاں
نور محمد کلہوڑے کا تعلق شاہ صاحب سے قائم
نہ رہا تھا۔ اور اس نے مثنوی کا ایک نہایت
عمدہ نسخہ شاہ صاحب کی خدمت میں پیش
کر کے ان کی نظر عنایت حاصل کی تھی۔
لیلا رام وطن مل کا بیان ہے کہ قرآن مجید،
مولانا روم کی مثنوی اور شاہ کریم کی سندھی
بیتیں ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہتی تھیں۔ اگر
اس کہانی میں سچائی کا کوئی شمہ بھی موجود ہے
اور غالباً یہ ایک حد تک سچی ہے، تو یہ دعویٰ
بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب اچھے
پڑھے لکھے آدمی نہ تھے۔(ح ۷)

اس اقتباس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خوش عقیدہ لوگ اپنے مرکز عقیدت کو قدرت کا یک خاص کرشمہ قرار دینے کی غرض سے ایسی داستانیں تیار کر لیتے ہیں لیکن شاہ صاحب کی تعلیم و تدریس کا پیمانہ کتنا ہی اونچا فرض کر لیا جائے اس کے باوجود وہ قدرت کے لطف و کرم کا یک خاص کرشمہ رہتے ہیں۔ جو کتابیں شاہ صاحب نے پڑھیں وہ ہر دور میں ہزاروں نے پڑھی ہوں گی، بلکہ اکثر کا مطالعہ شاہ صاحب سے یقیناً بدرجہا وسیع تھا تاہم ان میں سے کوئی بھی پر تاثیر حقائق گوئی میں شاہ عبداللطیف نہ بن سکا۔

ہزار نکتہ باریک تر ز موا ینجاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

سارلے کے بیان کے مطابق بے شمار لوگوں نے شاہ صاحب کے حلیے کی متعلق جو معلومات فراہم کیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جسم کے توانا، خوبرو اور متوسط القامت

۷۔ "شاہ عبداللطیف" ص۔ ۴۷ا

آدمی تھے۔ داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ آنکھیں بڑی خوب صورت اور سیاہ رنگ کی تھیں۔ بشرے سے ہوشمندی ٹپکتی تھی، پیشانی چوڑی اور اونچی تھی، چہرہ پر متانت تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ عمیق خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ قلب حقیقت شناس تھا اور ہر لحظہ سوچ بچار میں منہمک رہتا تھا۔

اخلاق کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے اوضاع و اطوار حلیمانہ اور گفتگو پر متانت تھی۔ لطف و مرحمت، رحم و ہمدردی اور جود و سخا ان کی جبلت میں داخل تھے۔ ان اوصاف و محاسن نے ان کے ذاتِ گرامی کو انتہائی احترام کا مرجع بنا دیا تھا۔ وہ سختی سے بیحد نفور تھے۔ یہاں تک کہ کسی انسان یا حیوان کو معمولی سی جسمانی تکلیف پہنچانا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔(ح ۸)

ایسے بلند پایہ، حساس اور حقیقت رس شاعر کی سیرت ایسی ہی ہو سکتی تھی۔ مولانا عبدالحق نے خواجہ حالؔی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ حیدر آباد گئے، وہاں ریاست کا ایک بڑا افسران سے ملنے کے لئے آیا۔ کوچبان نے گاڑی جائے قیام سے ذرا آگے بڑھادی۔ اس افسر نے چابک لے کر کوچبان کو مارا۔ خواجہ حالؔی اوپر کی منزل سے اس نظارے کو دیکھ رہے تھے۔ بعد میں بتایا کہ میں لیٹتا ہوں تو اب تک مجھے چابک پڑنے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ شاہ عبداللطیف کے آزادانہ اور قلندرانہ طور طریق دیکھ کر مٹیاری کے سیدوں نے میاں نور محمد کلہوڑا کے پاس شکایات کیں اور سیدوں کے اثر و رسوخ کے باعث میاں صاحب کے دل میں شاہ صاحب کے خلاف ایک گونہ مخالفت پیدا ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس داستان میں سچائی کا کوئی پہلو موجود ہو اور جب خاندان کے اکثر افراد اپنے کسی بھائی بند کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کہیں تو کسی شخص کا ان سے متاثر ہو جانا غیر اغلب نہیں۔ سارلے نے لکھا ہے کہ آخر میں میاں نور محمد کو شاہ عبداللطیف کے خلوص اور بلندی منزلت کا یقین ہو گیا تھا اور شاہ صاحب سے اس نے دوستی پیدا کر لی تھی۔ بلکہ عام روایت کے مطابق میاں غلام شاہ کی پیدائش شاہ صاحب ہی کی دعا و برکت کا نتیجہ تھی۔(ح ۹)

۸۔ "شاہ عبداللطیف" ص۔ ۱۷۲

شاہ عبداللطیف نے میاں نور محمد خاں سے دو برس پیشتر ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں وفات پائی۔ ان کے مریدوں میں سے کسی نے مندرجہ ذیل تاریخ کہی :

شاہ صاحب، زوالمواھب سیدِ عبداللطیف
آنکہ قطبِ وقتِ خود از مردانِ حق
چوں ز جامِ ارجعی مخمور نوشِ وصل شد
گفت ملہمِ غیب سالِ رحلتش رضوانِ حق

۱۱۶۵ھ (ح ۱۰)

دو تاریخیں شیخ محمد پناہ رجا نے کہیں

۱۔ گرویدہ محو عشقِ وجود لطیف میر
۲۔ شد محو در مراقبہ جسم لطیفِ پاک (ح ۱۱)

دونوں سے ۱۱۶۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔

بھٹ ہی میں دفن ہوئے۔ ۱۷۵۴ء میں میاں غلام شاہ خان نے شاہ صاحب کا مقبرہ بنوایا۔ صاحب "تحفۃ الکرام" نے لکھا ہے :

"روزے کہ ازیں سرا نقل فرمودہ در ماتش
جمعے از مریداں جاں دادند مزار متبرکہ اش
بر آں بہ ہیئت عجیب جائے باروح و صفاست۔
گنبد عالی بر مرقدش بنا یافتہ و راجا جیسلمیر
نوبت نذر نمودہ۔ صبح شام درگاہش عجیب روح
و سرور و غریب صفاو حضور دارد۔" (ح ۱۲)

جس روز شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔ ماتم میں کئی مریدوں نے جانیں دے دیں۔ ان کا مزار متبرک عجیب جگہ ہے جو روح و صفا سے معمور

۹۔ "ایضا" ص ۱۷۳
۱۰۔ "تحفۃ الکرام" ص۔ ۱۵۳ جلد سوم
۱۱۔ "مقالات الشعراء" ص۔ ۲۰۹
۱۲۔ "تحفۃ الکرام" ص۔ ۱۵۳ جلد سوم

ہے، اس پر عالی شان گنبد بن گیا۔ راجا جیسلمیر
نے بھی نذر بھیجی۔ صبح و شام ان کی درگاہ پر
عجیب روح و سرور اور صفا حضور رہتا ہے۔

منقولہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی میں شاعری کی وجہ سے نہیں صرف اپنی زندگی اور روحانی فیض رسانی کے اعتبار سے مشہور تھے اور ان کی رفعتِ شان کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ کئی ان کے غمِ مفارقت کی تاب نہ لا سکے اور فوت ہو گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب عالم کیف میں شعر کہتے تھے اور بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اپنے کلام کی فراہمی کا کوئی خیال نہ تھا۔ دو ارادت مندوں نے پورا کلام جمع کر لیا۔ شاہ صاحب نے اسے دیکھا تو اٹھا کر ڈھنڈ (جھیل) میں پھینک دیا۔ بعد میں ان ارادت مندوں نے شاہ صاحب کو رضا مند کر کے دوبارہ مجموعہ مرتب کر لیا یہ مجموعہ "شاہ کا رسالہ" کے نام سے مشہور ہے۔ (۱۹۵۸ء)

جس کی چاہت میں تو تڑپے، وہ بھی تجھ کو چاہے
فاذکرونی اذکرکم، پی کی بات سمجھ لے
ایسا وہ پریتم ہے، شیریں لب اور ہاتھ میں خنجر
(شاہؒ)

مولانا اعجاز الحق قدوسی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری

یوں تو سندھ میں بڑے بڑے صوفی، درویش اور شاعر پیدا ہوئے، لیکن جو شہرت اور مقبولیت بحیثیت ایک روحانی پیشوا اور شاعر کے شاہ عبداللطیف کو میسر آئی وہ دوسروں کا حصہ نہ بن سکی۔ ایک طرف ان کی ذات فیوض و برکات کا سرچشمہ تھی تو دوسری طرف ان کی شاعری اپنے اندر اثر و تاثیر، سوز و گداز کا ایک خزینہ لئے ہوئے تھی۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان کا ہر شعر روح کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور دل کی پہنائیوں میں اتر جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے پاکیزہ نغموں سے سندھ کے گاؤں، قصبے اور شہر گونج اٹھے اور ان کی درویشی اور شاعری کی شہرت اپنے وطن سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیلی۔ اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے تعلیم یافتہ طبقہ بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور ناخواندہ طبقہ بھی ان کے اشعار میں ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ آج بھی عورتیں گھروں میں، کسان کھیتوں میں بچے گلیوں میں، صوفیا خانقاہوں میں شاہ کے کلام کو پڑھتے اور سر دُھنتے ہیں۔

ابتدا ہی سے علم و عرفان، سلوک و معرفت کا نور آپ کے چہرے سے ہویدا تھا آپ زمانۂ شعور ہی سے ذکر و فکر میں مصروف رہتے تھے، کہتے ہیں کہ کچھ دن آپ پر عشق مجازی کا بھی غلبہ رہا اور اسی حیرانی میں آپ جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ صحرانوردی کرتے رہے۔ آخر عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا راہبر بنا اور ایک دم دل انوارِ الٰہی سے روشن ہو گیا، اور آپ صحرا نوردی چھوڑ کر ایک خاص مقام پر یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔

شاہ عبداللطیفؒ نے سترھویں اور اٹھارویں صدی کے بہت سے انقلابات دیکھے تھے۔ اورنگ زیب نے جب وفات پائی تو اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنتِ مغلیہ کے عروج کا آفتاب زوال پذیر ہو رہا تھا، ان کے وطن میں خاندان کلہوڑا

کی حکومت مرکزی حکومت کا جوا کندھے سے اُتار کر تیزی سے خود مختاری کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ انہوں نے وہ وقت بھی دیکھا کہ جب سندھ کو نادر شاہ(۱) نے لوٹا، اور کلہوڑا فرمانروا ایران کے باجگزار بنے۔ انہیں کے سامنے وہ وقت بھی آیا جب احمد شاہ ابدالی دندناتا ہوا دہلی آیا اور اس نے سندھ کو کابل کے ماتحت بنایا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ایک طرف سیاسی نظام متزلزل ہو رہا تھا تو دوسری طرف اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ فکر و عمل و اخلاق و کردار کا توازن بگڑ چکا تھا۔ طبقاتی تفاوت نے غریبوں کے لئے زندگی کو ایک عذاب بنا دیا تھا۔ زندگی کی ساری راحتیں امیر اور دولت مند طبقے کے لئے تھیں اور غریب بیچارے زمین کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔ صوفیائے خام اور علمائے سوء رشد و ہدایت کے پردے میں گمراہیوں کو رواج دے رہے تھے۔ یہ تھا وہ ماحول جس نے شاہ عبداللطیفؒ کے حساس دل کو بے حد متاثر کیا۔ انہوں نے وقت کی آواز کو پہنچانا اور دکھی انسانیت کو محبت کا پیغام دیا۔ آپ کی ساری زندگی کی جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کے رشتے کو خدا سے جوڑا جائے رسولِ اکرم ﷺ کی محبت سے قلوب کو گرمایا جائے۔ بگڑی ہوئی زندگی کو حسنِ اخلاق اور پاکیزہ کردار سے آراستہ کیا جائے ظلم کے خبیث درخت کو اکھیڑ کر انسانیت کو محبت و خلوص سے آشنا کیا جائے۔

بھٹ میں قیام فرمانے کے بعد تقریباً چالیس سال تک اس مقصد کے لئے شاہ عبداللطیف نے جو انتھک کوشش کی ہے، ان کی پوری شاعری اس پر گواہ ہے۔ انہوں نے اپنے پیغام کو عام بنانے کے لئے اپنی شاعری میں سندھ کی ان رومانی داستانوں کو بنیاد بنایا ہے جنہیں سندھ کے لوگ بڑے ذوق و شوق سے سنتے تھے۔ انہیں کہانیوں کے پردے میں آپ نے عوام کے دکھوں اور غموں کی ترجمانی کی ہے، اور ان میں زندگی کی ایک نئی اُمنگ اور ولولہ پیدا کیا ہے۔ خالق اور مخلوق کی محبت اُن کی شاعری کا موضوعِ خاص ہے اُن کی شاعری میں تصوف اور شعریت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے کہ پڑھنے والا ان کے نغموں میں ایک روحانی کیف محسوس کرتا ہے۔ شاہ عبداللطیف کو غریبوں سے بیحد محبت تھی۔ وہ اُن کے دکھ درد کو

---

(۱) نادر شاہ ۱۱۵۲ھ کے آواخر میں سندھ آیا اور ۱۱ محرم ۱۱۵۳ھ کو لاڑکانہ سے ایران روانہ ہوا اور ۱۱۶۰ھ میں قتل ہوا۔

محسوس کرتے اور اپنی شاعری میں عوام اور غریبوں کی ترجمانی کرتے تھے۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عبداللطیف ''شاہ بندر'' گئے اور کسی قریب کے گاؤں میں شتربانوں کے خیمے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ اونٹ چیختے، چلاتے اور بلبلاتے ہوئے آئے۔ آپ نے اونٹ والوں سے اس کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈیرے نامی گاؤں کا حاکم جو بہت بڑا ظالم انسان ہے، اس گاؤں میں جو غریب اونٹ والے بھولے سے آنکلتے ہیں یہ ان اونٹوں کی ٹانگوں اور دُموں میں کپڑے کے گولے بنوا کر ان گولوں میں آگ لگوا دیتا ہے۔ جب وہ جلنے کے تکلیف سے بلبلاتے ہیں تو بہت خوش ہوتا ہے۔ اس وقت بھی یہ اونٹ اسی تکلیف سے بلبلا رہے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کو یہ بات سُن کر بہت دکھ ہوا اور اونٹوں کو دیکھ کر بڑا رحم آیا۔ آپ نے اسی وقت سندھی میں ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ :

یہ محل غارت ہوں، شتربانوں
کے خیمے آباد رہیں، میں اونٹنیوں کے
دُودھ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔
شتربان ہمیشہ آباد رہیں، اور ان
کو ستانے والے دُودھ کو ترسیں۔

پھر شاہ نے اُن اونٹ والوں سے کہا، جاؤ میرے بیٹو! کچھ دن نہیں گزرتے دے۔ ہر قوم کے محل ویران ہو کر اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ بنیں گے۔ کہتے ہیں کہ کچھ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ گاؤں ویران ہو کر اونٹوں کی بیٹھنے کی جگہ بنا۔ (۲)

حلم وعفو کی درویشانہ صفت آپ میں بدرجۂ کمال موجود تھی، خدا کی مخلوق سے عناد رکھنے کو آپ خلافِ طریقت سمجھتے تھے۔ مرزا مغل بیگ ارغون کی لڑکی آپ سے منسوب تھی لیکن مرزا مغل بیگ کسی وجہ سے آپ سے انتہائی بغض وعداوت رکھتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آپ کے کسی مرید نے آپ کے سامنے اُس کی یہ تاریخِ وفات کہی۔

بود خبیث
۱۲۲۴ھ

---

(۲) حوالہ مضمون بعنوان ''شاہ پر تحقیق'' از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔
مطبوعہ ''نذرِ لطیف''

آپ نے سنا تو فرمایا کہ ایسامت کہو بلکہ کہو۔

یک مغل بہ بود

۱۲۲۴ھ

شاہ کی شاعری پر اُن کے تبصرہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ سندھی زبان، سندھ کی قدیم تہذیب اور تصوف کے حقائق و معارف پر وسیع نظر رکھتا ہو۔ ان عناصر کے بغیر اُن کے شعر کی اعماقِ روح تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن اس وقت تک ان کے کلام کا جو حصہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے ہم اس میں سے چند دو ہے نمونتاً یہاں نقل کرتے ہیں جو اُن کے شاعرانہ کمالات کے مظہر ہیں اور جن میں ان کی فکرِ رسا نے تصوف کے نہایت باریک نکات کو بیحد حُسن اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک جگہ خود ہی انہوں نے اپنے کلام کے مقصد اور مطمع نظر کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے :

اس کلام کو معمولی اشعار نہ سمجھو، یہ آیات ربانی ہیں۔
یہ آیات، پڑھنے والوں کو محبوبِ حقیقی کی طرف لے جاتی ہیں۔

ایک جگہ وہ اپنے محبوب کے استغنا اور شانِ جمال کو بیان کرتے ہوئے، جو دلکش اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ شاید ہی اس کی مثال ہمیں کسی دوسرے زبان کی شاعری میں مل سکے۔ فرماتے ہیں :

جب میرا محبوب اپنی شانِ جمال
کے ساتھ خراماں ہوتا ہے تو زمین
بھی بسم اللہ پکارا ٹھتی ہے۔
دیکھو جہاں جہاں اس کے قدم گزرے وہاں راہ
بھی بوسہ زن ہے۔
حوریں ایک طرف ادب سے کھڑی ہیں۔
میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے محبوب کا چہرہ سب سے زیادہ حسین ہے۔ عاشق

---

(۳) مقالات الشعراء" مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ۔ ص۔ ۴۲۹

کے کردار کی بلندی، محبوب کے دیئے ہوئے درد کی لذت اہل درد سے الفت، ان کیفیات کو شاہ نے جس نفاست اور دلکشی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ وہ آپ اپنی مثال ہیں فرماتے ہیں!

کسی نے پوچھا تمہارا محبوب کبھی تم سے بات کرتا ہے؟

"نہیں"

"پھر وہ محبوب کیسا؟"

"محبوب کا سکوت ہی میرے لئے سلام ہے۔"

میری آنکھوں نے مجھ پر
احسان کیا کہ میرے گھر کے سامنے سے
ہزاروں انسان گزرتے ہیں لیکن
وہ کسی کو نہیں دیکھتیں۔

میری آنکھیں اگر محبوب کے سوا
کسی اور کو دیکھیں تو اے کاگا! ان کو
نکال کر گڑھے میں ڈال دے۔

میرے دل میں درد اٹھا کر چلے
گئے اور مجھے یہ درد اس لئے پیارا
ہے کہ وہ محبوب کا دیا ہوا ہے۔
اس لئے مجھے طبیبوں کی آواز بھی
بری لگتی ہے۔ مجھے طبیبوں کے
پاس بیٹھنا بھی گوارا نہیں اس لئے
کہ میرا سب سے بڑا دوست
تو محبوب کا دیا ہوا درد ہے۔

اُن کا دیا ہوا زخم سدا مجھ
سے یہ کہتا رہتا ہے کہ طبیب کے
پاس مت جاو ورنہ میں اچھا
ہو جاؤں گا۔

آؤ چلیں ایک رات اُن کے
پاس گزاریں، جن کے جسم درد سے
چاک ہیں لیکن جب لوگ آتے
ہیں تو اُن سے اپنا درد چھپاتے ہیں

حسن کی معصومیت، اس کی توصیف کے نغمے شاہ نے جس انداز سے گائے ہیں اس انداز فکر تک دوسروں کی رسائی نہیں۔

فرماتے ہیں:

میرے محبوب کی پیشانی سے
نیکیوں کے انوار ہویدا ہیں۔ یہی وجہ
تو ہے وہ مجھ جیسے بدا اطوار کے
پاس آنے سے گریز نہیں کرتا، اسی
لئے تو میں دوستوں سے کہتا ہوں
کہ سورج و چاند میرے محبوب کا
مقابلہ نہیں کر سکتے، اُن میں حسن
تو ہے، نیکی نہیں۔

میرا محبوب مجسم بھلائی ہے
وہ یہ بالکل فراموش کر چکا ہے
کہ وہ سرتا پا نیکی ہے، اس کی نیکی
اور معصومیت کی سب سے بڑی
دلیل یہ ہے کہ وہ میرے پاس آیا
تھا لیکن اُس نے مجھ سے میرے
عیبوں اور میری کوتاہیوں کا کوئی
ذکر نہیں کیا۔

اے چاند! تو میرے محبوب
کا مقابلہ کرتا ہے؟ میں تجھے للکارتا
ہوں۔ تو چودھویں رات کا جو
سنگھار چاہے کر ساری کائنات
کا حسن اکٹھا کر لے، لیکن میرے
محبوب کے ایک جلوے کی بھی
برابری نہیں کر سکتا۔

تم اور تمہارے جیسے ایک سو
چاند بھی نکل آئیں، پھر بھی محبوب
کے بغیر میرے لئے اندھیرا رہے
گا، جاؤ جلدی سے غروب ہو جاؤ
کیونکہ تمہاری روشنی میں محبوب
نہیں ماننا چاہتا۔

شاہ کی شاعری کا اصل موضوع وحدت الوجود ہے۔ انہوں نے اٹھارویں صدی عیسوی میں اس نظریہ کی اشاعت میں نہایت اعتدال اور احتیاط کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ وہ اپنے کلام میں جابجا نئے ڈھنگ سے اس نظریہ کو بڑے دلآویز طریقے پر پیش کرتے ہیں مگر احتیاط کے دامن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

"جنگل اور صحرا میں تو کیوں
جاتا ہے، کیوں اپنے محبوب کو
اِدھر اُدھر ڈھونڈ تا ہے! کہتا
ہے لطیف محبوبِ حقیقی کسی
دوسری جگہ نہیں چھپا ہے، آنکھوں
کو نیچے کر کے دیکھ، تیرے اندر
ہی دوست کا مسکن ہے۔

معرفتِ حقیقی حاصل کرنے
کے لے بہت سے راستے ہیں،
کوئی بھی راہ اس کا مشاہدہ کرا
سکتی ہے، ایک قصر ہے جس کے
لاکھوں دروازے اور ہزاروں
کھڑکیاں ہیں جس طرف نظر پھیرتا
ہوں، ادھر خدا کا جلوہ ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے حب الوطنی کو ایمان کی نشانی قرار دیا ہے۔ شاہ عبداللطیفؒ کو اپنے وطن (سندھ) سے غیر معمولی محبت تھی۔ انہوں نے اپنے وطن کے لئے خیر و برکت کی دعا کی ہے۔

مالک رکھنا سندھ میں سدا باغ بہار
اے سب کے دلدار سکھی رہے سنسار سب

حب الوطنی شاہ کی شاعری کا موضوعِ خاص ہے، وہ نت نئے طریقوں پر اپنے اہلِ وطن کے قلوب میں محبتِ وطن کے چراغ روشن کرنا چاہتے ہیں، ماروی کے پردے میں وہ اپنے ہم وطنوں کو حب الوطنی کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر میں پردیس میں مرجاؤں تو
میری مٹی بیابانوں میں بستے ہوئے
غریب رشتے داروں کے ساتھ
ملانا اور میری میت کو آبائی وطن
کی باڑوں سے دھواں دینا۔

ایک اور دوہے میں فرماتے ہیں:

میری خواہش ہے کہ اپنے
وطن کو دیکھتے دیکھتے جان دوں۔
میرے جسم کو قید نہ کرنا۔
پردیسن کو اس کے محبوب سے
جُدا نہ کرنا۔
میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے
وطن تھر کی ٹھنڈی مٹی
اپنی سر پر ڈال لوں۔
اگر میں پردیس میں مرجاؤں
تو میرے لاش کو ملیر میں دفن کرنا۔

شاہ کی حب الوطنی کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں جب

کہ سندھ میں فارسی شاعری کا چرچا تھا اور اس دور کے سندھی شعراء فارسی میں شعر کہنا اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ فارسی زبان کو ایک سرکاری حیثیت حاصل تھی اور فارسی شاعری ہی سے اس زمانے کے اُمراء اور اہلِ کمال کی مجلسیں گونجتی تھیں۔ عین اس زمانے میں جب کہ سندھ میں فارسی شاعری کی مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، شاہ نے زمانے کی رَو سے ہٹ کر سندھی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا۔ اور اپنی بے مثل شاعری سے سندھی زبان کو مالا مال کر دیا۔ اس لحاظ سے شاہ عبداللطیفؒ سندھی زبان کے سب سے بڑے محسن۔ ہیں وہ اپنے وطن کی بے عملی اور جامد زندگی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں، اور اس جمود کے طلسم کو توڑنے کے لئے وہ سندھی معاشرے کی ایک قدیم رسم کو تمثیل بنا کر عمل اور حسن عمل کی عجیب دلکشی انداز میں دعوت دیتے ہیں:

تمہیں کاتنے سے ذرا دلچسپی
نہیں۔ سوئی ہوئی کروٹیں بدل
رہی ہو۔ یکایک عید آئے گی، لوگ
نئے کپڑوں سے محروم رہیں گے،
خود تمہارے پاس بھی کپڑے
نہیں ہوں گے، جب تمہاری
سہیلیاں تمہیں باہر لے جانے
کو آئیں گی۔

گرمی سردی میں چلتے رہو،
بیٹھنے کا وقت نہیں، کہیں ایسا
نہ ہو کہ اندھیرا ہو جائے اور محبوب
کے قدموں کا نشاں نہ مل سکے

بارش کی پہلی بوند پڑنے پر اہل سندھ کی زندگی میں جو ولولے اور امنگیں پیدا ہوتی ہیں ان کی کی عکاسی شاہ کے قلم نے جس اچھوتے اور انوکھے انداز میں کی ہے، وہ سندھی ادب کا بہترین شاہکار ہے۔ فرماتے ہیں :

دیکھو لطیف! گھنے بادل نیچے
اُتر رہے ہیں اور پانی کی بڑی
بڑی بوندیں پڑنے لگیں، اپنے
بیلوں کو باہر نکالو اور میدانوں
کا رُخ کرو۔ یہ وقت مایوس
بیٹھنے اور سستی کرنے کا نہیں۔
لو دیکھو پھوار پڑنے لگی۔

کل رات پدم جھیل پر بارش
کے دیوتا نے گھڑے کے گھڑے
انڈیل دیئے لیکن وہ جن کے شوہر
پردیس میں ہیں، ان بادلوں کو
دیکھ کر غمگین ہیں۔
وہ موسم آگیا جب لوگ خوش
ہو کر باتیں کرتے ہیں، اور موسیقی
کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کسان
اپنے ہل درست کر رہے ہیں۔
گلہ بان خوش ہیں، اور میرے
محبوب نے بارش کی خوشی میں
اچھے سے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔

جو لوگ قحط کے سہارے پر
جیتے ہیں، اور جو لوگ کنجوس ہیں
اُن سے کہو کہ چلے جائیں، گایوں
کے گلے بارش کی خبر لا رہے ہیں
تیری رحمت کو اپنے قریب
محسوس کر رہے ہیں۔

ساون کی رات آئی، قہقہے
اور چہچہے بلند ہوتے ہیں۔
کوئل کی تیکھی تیکھی کوک فضا
کو چیرتی ہے۔
ہاریوں نے ہل جوت لئے،
گویئے خوش ہیں۔
برکھا کی رت آگری، خوشی
کے چہچہے اور میٹھے زمزمے بلند
ہوئے، مٹکے مکھن سے بھرپور
ہو گئے۔

ایک جگہ وہ راہِ محبت کے راہیوں کو عشق کی راہ کی کٹھنائیوں سے واقف کراتے ہوئے نہایت ہی شیریں الفاظ میں دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

دار اور سولی پر چڑھنے کی
دعوت دی جارہی ہے۔
میرے ساتھ اگر کسی کو چلنا ہے

تو چلے۔

دار پر جانا اُن لوگوں کا کام

ہے جو محبت کا نام لیتے ہیں۔

سولی عاشقوں کو اپنی طرف

بُلا رہی ہے۔

اگر تم عشق و محبت کے

طالب ہو تو پیچھے مت ہٹو۔

پہلے سر تن سے الگ رکھو پھر

محبت کا نام لو۔

سولی اور دار تو حقیقت میں

عاشقوں کے لئے باعثِ زیب و

زینت اور سنگھار ہے۔

ہچکچانا یا پیچھے ہٹنا تو اُن

کے لئے ایک عتاب ہے۔

وہ تو برملا دار پر آتے ہیں

محبت کی راہِ و رسم میں

قربان ہونا۔

اور سر کا تن سے جُدا ہونا۔

عاشقوں کی زندگی کا

جزوِ لاینفک ہے۔(۴)

(۱۹۵۹ء)

---

(۴) یہ تمام اشعار "نذر لطیف" شایع کردہ محکمۂ اطلاعات سندھ کے مختلف مضامین سے ماخوذ ہیں

اے کے بروہی
مترجم: ڈاکٹر نجم الاسلام

شاہ لطیفؒ ایک عظیم فلسفی

فکر کی زندگی میں شاہ عبداللطیف نے جو اضافہ کیا ہے اس پر بحث کرتے وقت یہ حقیقت لازماً پیش نظر رکھنی ہو گی کہ ہم یہاں پاکستان فلسفہ سوسائٹی کے زیر سرپرستی جمع ہوئے ہیں۔ لہذا ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ اپنی توجہ فکر کی زندگی میں شاہ عبداللطیف کے اضافے کے فلسفیانہ پہلو پر مرکوز کریں۔ اس ایک عہد پرانی نزاعی بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ حقیقت تک رسائی کے شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز باہم ایک دوسرے سے متناقض ہیں یا نہیں۔ محتاط غور و فکر سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح استدلال کی روشنی میں دوسرے دو قسمی یا دو پہلو مسائل کی، جیسا کہ وہ ہمارے تصور حقیقت میں آشکار ہوتے ہیں، شناخت کی جاتی ہے، اس طرح یہ نزاع بھی حقیقت سے زیادہ لفظی ہے۔ ذہن انسانی کے ان دو بظاہر متخالف رجحانات کے عظیم نمائندوں کی اعلیٰ ترین مثالیں ہمارے سامنے ہیں، مثلاً یہاں ہم لکریشیس (Lucretius)، ڈانٹے (Dante) گوئٹے (Goethe)، جلال الدین رومی، جارج سانتایانا (George Santayana) اور اقبال جیسے بلند پایہ فلسفی شعراء کا نام لے سکتے ہیں۔ لا متناہی بحثیں اس سوال کا جواب دینے کے لیے چلی ہیں کہ ان لوگوں کے شعور و احساس پر شاعرانہ وجدان غالب تھا یا فلسفیانہ تفکر۔ لیکن یہاں اور ہر کہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان زیر بحث فلسفی شعرا کی تخلیقات کے امتیازی پہلوؤں پر مصنوعی لیبل لگا کر بحث کو آگے بڑھانے سے حقیقت کے سراغ میں کبھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اعلیٰ تر شاعری اور سدا بہار فلسفے، دونوں کا صدور و ظہور ہمارے وجود کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے میں یہ جسارت نہیں کروں گا کہ لطیف کی شخصیت کو کھینچ بھانچ کر کسی

خطبۂ صدارت پاکستان فلسفہ کانفرنس منعقدہ اسلام آباد ۳۰ مئی ۱۹۷۹ء

مخصوص اور معین سانچے میں ڈھال دوں۔ وہ آفاقی جوہر سے اس قدر سرشار ہیں کہ اس قسم کے سلوک سے وہ اثر پذیر ہو ہی نہیں سکتے۔ بلاشبہ وہ بڑے اعلیٰ مرتبے کے شاعر ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کے انھوں نے کائنات اور اس میں انسان کے مقام کے تعین کے بارے میں ہمارے سامنے منطقی طور پر کوئی مستقیم نظریہ پیش نہیں کیا ہے۔ ہر عظیم شاعری اور فلسفے کی راہیں حقیقت کے اظہار کے معاملے میں جدا جدا ہیں لیکن پھر بھی دونوں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ انسان کے اندر اپنی ذات کے ترفع کی تحریک پیدا کریں اور حقیقت کا ایک ایسی دوررس نظر سے نظارہ کرنا سکھائیں جو محض آج کی اور سامنے کی مانوس دنیا ہی میں الجھ کر نہ رہ جاتی ہو بلکہ اس سے آگے بھی حقیقت کا ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہاں کانفرنس کے شرکاء میں سے بیشتر حضرات وہ ہیں جو سندھ سے نہیں آئے ہیں، میں یہ فرض کر لینے میں کچھ بہت غلطی پر نہیں ہوں کہ شرکاء کی اکثریت شاہ عبداللطیف کی شاعری کے تاریخی پس منظر سے بخوبی اور کامل طور سے واقفیت نہیں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس کی کاروائی کے آغاز ہی میں آپ کے سامنے اس عہد کی کچھ بین اور زیر بحث موضوع سے متعلق تفاصیل پیش کروں جس میں لطیف نے زندگی بسر کی، تاکہ حقیقت کی نوعیت اور بالخصوص انسان کے کار منصبی کے متعلق لطیف کے عمومی فلسفیانہ مقام کا یہاں ذیل میں بہتر طور سے احاطہ کیا جاسکے۔

شاہ عبداللطیف اٹھارہویں صدی کے ایک سندھی عارف باللہ، صوفی شاعر اور بزرگ ہیں۔ ان کے سنین ولادت و وفات فاضلانہ تحقیق کے بعد بالترتیب ۱۶۷۹ء اور ۱۷۵۲ء متعین کئے گئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلھوڑا خاندان سندھ پر حکمرانی کر رہا تھا۔ زیادہ صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس زمانے کا مشاہدہ کیا جسے باعتبار زوال حکومت، شام کے جھٹ پٹے کا وقت کہا جاسکتا ہے جب کہ ہندوستان میں ایرانی اثرات کا ستارہ ڈوب چکا تھا، اور افغانی تسلط کا ستارہ عروج پر تھا۔ اس زمانے کے گروہ پیش میں کلھوڑا سندھ پر اپنے تسلط کو مستحکم کرتے نظر آتے تھے، لیکن بیشتر اس کا سبب یہ تھا کہ دہلی کے

ارباب اقتدار کی بے بسی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ بلاشبہ اُن کے مقرر کیے ہوئے سندھی گورنروں کو آزادی کامل تو حاصل نہ تھی لیکن اور سب طرح بااقتدار ہوتے تھے، گو کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ دہلی کے حکمرانوں کی طرف سے کسی سنگین کاروائی یا حملے کے وقت گھٹنے ٹیک دینے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے۔ ابتداً سندھ کو مغلیہ سلطنت میں اکبر نے ۱۵۹۲ء میں شامل کیا تھا اور ۱۷۳۷ء میں یہ پہلی بار ایرانیوں کے زیر تسلط آیا اور پھر ۱۷۴۷ء میں افغانوں کے زیر نگین ہوا (ملاحظہ ہو ایچ۔ ٹی۔ سورلے کی انگریزی تصنیف "شاہ عبداللطیف آف بھٹ" صفحہ ۹)۔ ضرور یہ زمانہ سندھ کے حکمرانوں کے لیے سعی و جہد اور صعوبات کا زمانہ رہا ہوگا اور تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے عوام الناس کی زندگیوں پر قابل لحاظ اثر بھی ضرور ڈالا ہوگا۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے سندھ کی تاریخ کے دھارے پر غور کرتے ہوئے اس حقیقت سے متاثر ہے کہ باوجود اس کے کہ سندھ مغرب کی جانب سے جزیرہ نمائے عرب کے ریگزار اور مشرق کی جانب سے ایشیا کے سر سبز خطے کی داب میں ہے۔ تاہم حیرت انگیز طور پر اس نے مظاہرہ کیا ہے کہ اس میں ایشیا کے تہذیبی ماحول سے یہاں پہنچ کر پڑنے والے بیرونی اثرات کے نفوذ کا مقابلہ اور مزاحمت کرنے کی، ایک قسم کی قوت اور صلاحیت ہے۔ بجائے اسکے، اس نے پیغمبر صحراؑ کے پیغام کو دل جمعی سے قبول کیا اور اس پر مضبوطی سے جما رہا ہے۔ سورلے کہتا ہے:

(ترجمہ) " بیشتر اوقات سندھ، گردوپیش کے باقی ماندہ ہمسایہ ایشیائی ممالک میں رونما ہونے والے، حقیقی طور پر فیصلہ کن اور نازک واقعات سے الگ تھلگ رہا ہے۔ بعض اہم تر واقعات نے سندھ کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ مگر اکثر و بیشتر صورتوں میں ان کے بالواسطہ اثرات بہت خفیف رہے ہیں۔ سندھ کی داستان اور اس کے عوام کی اس الگ تھلگ رہنے کی صفت کو بہترین طور پر اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ اس کی مثال ایک تالاب کی سی ہے جس میں وقتاً فوقتاً باہر سے ایک سنگ ریزہ پھینک دیا جاتا ہو، جس کے پانی میں گرنے

سے کچھ لہریں پیدا ہوتی ہوں اور ایک بار پھر وہی سکون و جمود طاری ہو جاتا ہو۔ یابا ستعارہ دیگر یوں سمجھئے کہ تاریخ ہند کے پر اضطراب مد و جزر کا ٹکراؤ سندھ کی خلوت گزینی کے بنجر پتھریلے ساحل سے ہوتا ہے اور صرف چند ایک کمزور سی لہریں ٹکرا کر ریتیلے ساحلی علاقے پر پہنچ پاتی ہیں۔ بے جانہ ہوگا، اگر سندھ کی تاریخ کو داستانی اور الگ تھلگ رہنے والی خصوصیات سے متصف قرار دیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو ہر دور میں اسکی آبادی کی اکثریت کی صلح کو جو طبیعت کا خاصہ رہی ہیں۔ اور جو بعد کے دور میں، بہت منایاں طور پر، اسلامی معاشرے کی مذہبی اساس کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔"

اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس واقعے کا صریح حوالہ دیں جو ۷۱۲ء میں اسلام کے عظیم سپاہی محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے صورت میں رونما ہوا اور جس نے صرف اسلام کے ہند میں داخلے کے لیے اسے باب الاسلام بنایا بلکہ ہند میں اسلامی تہذیب و تمدن کی سرحدی چوکی بنادیا۔ یہ صورتِ حالات تسلسل کے ساتھ اس وقت بھی برقرار رہی جب کہ تین سو سال بعد ہندوستان پر مسلمانوں کا ایک زیادہ منظم حملہ ہوا۔ اس مرتبہ یہ حملا بر صغیر کی شمال مغربی دیوار احاطہ کی جانب سے تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا کسی خدائی تدبیر کے تحت جس کی صحیح نوعیت صرف قیاس کا موضوع بن سکتی ہے۔ سندھ کو ہند کے غربی حصے میں ایک پود کیاری کا کردار تفویض کیا گیا تھا جہاں پنیری تیار کر کے مشرق میں بوئی جاسکے۔ ادب القدما (کلاسیکل لٹریچر) میں بر صغیر کی دو نمایاں جغرافیائی، سیاسی حقیقتوں کے حوالے ملتے ہیں۔ یعنی سندھ اور ہند۔ سندھ سے مراد وادی سندھ تھی اور بر صغیر کا باقی ماندہ علاقہ ہند تھا۔ سندھ اسلام کی غیر معمولی اختراعی اور تخلیقی قوتوں کو ایک ایسے انداز میں پھلنے پھولنے کا سازگار ماحول مہیا کرنے کے لیے مختص نظر آتا ہے کہ جسکی مدِ مقابل نظیر کے طور پر نہ تو عرب کے مغرب میں واقع کسی مقام یا خطہ زمین کا نام لیا جاسکتا ہے اور نہ مشرق میں واقع کسی مقام یا خطہ زمین کا۔ اسلام کی پہلی لہر جسے ہم محمد بن قاسم کے عساکر سے منسوب کرتے ہیں، ایک "خالص لہر" تھی، مگر جو لہر تین سو سال بعد ہندوستان کی شمالی مغربی دیوار احاطہ سے ٹکرائی

اور نفوذ پذیر ہو کر سیدھی دہلی تک جا پہنچی، اور کچھ ہی عرصے بعد اس سے بھی آگے تک پہنچی، بلا شبہ تھی تو ایک مسلم لہر لیکن خراسان، غزنی، بلخ اور بخارا سے آنے والے بیرونی اثرات کے سبب سے کچھ گدلا گئی تھی۔

شاہ عبداللطیف سندھ کے مشہور عارف باللہ، شاہ عبدالکریم بلڑیؒ کے پڑپوتے تھے، تازہ تحقیق کے نتیجے میں ہمیں ان کے دادا کے ہرات سے سندھ آنے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کے سلسلے میں کچھ تفصیلات ملتی ہیں۔ شاہ عبداللطیف کے والد، شاہ حبیب بھی بڑے متقی اور پارسا انسان تھے، اور زیریں سندھ میں رہتے تھے۔ جو کچھ مختصر سا تاریخی مواد دستیاب ہے اس کی مدد سے مرزا قلیچ بیگ نے شاہ عبداللطیف کی سوانح عمری از سر نو مرتب کی ہے۔ اور بعد میں اسکی تفصیلات پروفیسر گربخشانی نے اہتمام تک پہنچائی ہیں جو "شاہ جو رسالو" (ادبی پیغام) کے نامور شارح ہیں۔ یہاں ہم دیارام گدومل اور لیلارام وطن مل کے ناموں کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔ ایچ۔ ٹی۔ سورلے کے مطابق، شاہ عبداللطیف نے ابتدائی دور میں کلہوڑوں کو برسر اقتدار آتے دیکھا۔ ان کی عمر پچاس برس کی تھی جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور سندھ کو ایران کا باجگذار بنایا۔ جب وہ اٹھاون برس کے تھے تو احمد شاہ درانی نے جان بلب شاہنشاہ دہلی پر کاری ضرب لگائی، جدید افغانستان کی بنیاد رکھی اور سندھ کو کابل کا محکوم بنایا۔ اس کے پانچ سال بعد، اور ٹھٹہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فیکٹری قائم ہونے سے چھ سال پیشتر، شاہ عبداللطیف نے ۶۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

شاہ جو رسالو کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ علوم قدیم سے بخوبی واقف تھے جن میں دستگاہ عربی، فارسی اور سنسکرت زبان و ادب کے مطالعے کے ذریعے حاصل کی جاتی تھی۔ وہ قرآن پاک اور حدیث سے وسیع اقتباسات پیش کرتے ہیں اور رسالو کے بعض بند ایسے ہیں جن میں اسلام کے ان مقدس ماخذوں کے وسیع اقتباسات جہاں تہاں بکھرے ملتے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ جب ان کے استاد نے ان سے حرف تہجی سیکھنے کے لیے کہا تو وہ الف سے آگے نہیں بڑھے۔ استاد نے جب حروف با کہلانا چاہا تو انھوں نے کہنے سے انکار

کر دیا، اور یہ کہہ کر استاد کو حیرت میں ڈال دیا کہ "باکا فائدہ؟ الف اکیلا میرے لیے کافی ہے"۔ فی الحقیقت، جب لطیف کے والد کی توجہ اس فقرے کی طرف دلائی گئی جو انکے بیٹے نے اپنے استاد سے کہا تھا تو انھوں نے بیٹے کو مشفقانہ تنبیہ کی اور فرمایا کہ زبان لکھنا پڑھنا سیکھنا ہے تو باقی حروف بھی سیکھنے ہی پڑیں گے۔

رسالو کا طریق تصنیف رسمی اندازکا نہ تھا۔ تمام مشمولہ اشعار اس طرح کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں گویا کہ ایک روحانی وجد کی حالت میں شاعر نے انہیں گایا ہے۔ انکے شاگرد ہر وقت انکے گائے ہوئے اشعار سننے کو موجود رہتے ہوں گے، اور انہیں یاد کر کے بعد میں قلم بند کر لیتے ہوں گے یا اسی وقت لطیف کی زبان سے سن سن کر لکھتے جاتے ہوں گے۔

لطیف کی شاعری کا کمالِ حسن یہ ہے کہ موسیقی کی عصری روایات سے مضبوطی کے ساتھ مربوط ہے، یہ گائے جانے کے لیے ہے۔ رسالو کے مشمولات کا انداز ترتیب بھی اسی بنیاد پر ہے کہ موزوں راگوں اور سروں کے عنوانات کے تحت اشعار کی تقسیم ابواب پر کی گئی ہے۔ بعض سُر مثلاً ماروی، لیلا چنیسر، یا سوھنی، بے شک ایسے ہیں کہ کسی قابل تحقیق راگ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری میں اس دور کے مروج قصوں سے بصورت تمثیل بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ مثلاً "سسی اور پنھوں"، "سوھنی میہنوال"، "عمر اور ماروی"، "لیلا چنیسر"، "مومل اور رانو"، وغیرہ۔ ان تمثیلات کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسان کی توجہ کو اس دنیا کی محویتوں اور مشغولیتوں سے ہٹا کر خدا کی طرف رہنمائی کی جائے جو ہمارا منتہائے مقصود ہے اور جس کی طرف بالآخر ہمیں پلٹنا ہے۔ ایک اہم موضوع جو لطیف کی شاعری کے تانے بانے میں اول سے آخر تک پھیلا ہوا ہے انسان کی یہ شدید پرانی آرزو ہے کہ ایک ایسی زندگی کا سراغ پالے جو اس کی موجودہ ہمہ ست زندگی سے بہتر اور زیادہ دیرپا ہو۔ لطیف انسانی زندگی کے اس اعلیٰ مقصد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے سوا کچھ حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ اور طریقہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ ہماری روزمرہ

زندگی کے مانوس تجربات سے کھونٹیوں کا سا کام لیتے ہیں جن پر وہ انسان کی بقائے دوام کی جستجو کا لبادہ آویزاں کر سکیں۔ ان کی شاعری رمزیت کے معاملے میں نہایت ممتاز طور سے تمثیلی ہے، تصوف کی زبان میں ان کی شاعری کو عارفانہ کلام کہا جا سکتا ہے۔ مراد یہ کہ یہ اشعار طالب کو علم روحانی یا معرفت بخش سکتے ہیں۔

لطیف کی شاعری تک رسائی ایک اور زاویہ نظر سے بھی ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں یہ زاویہ نظر بھی یکساں طور پر بجا ہے: ان کے رسالو کا انسان کی اس دنیاوی زندگی اور مالک حقیقی کے ساتھ، جس کا وہ بندہ ہے اور جس کی طرف اُسے پلٹنا ہے، اس کے رشتے سے اٹھنے والے مسائل کے بارے میں قرآن مجید کے پیش کردہ بنیادی حل کی تشریح و ترجمانی قرار دیا جاتا ہے۔ انسان، قرآن کے مطابق، یہاں خلیفۃاللہ فی الارض یعنی اس دنیا میں خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو سارے کا سارا رسالو انسان کو مالکِ حقیقی کی یاد دلانے کی ایک دعوت معلوم ہوگا اور ذکر الٰہی سے مملو نظر آئے گا۔ اس کی ایک ہی لگن ہے کہ کسی طرح انسان کے اندر محبت الٰہی کے میلان کی تحریک و ترغیب کی جائے۔

لطیف نے خود اپنے ایک بیت میں دعویٰ کیا ہے:

جي تو بيت ڀانئيا، سي آيتون آهين،
نيو من لائين، پريان سندي پار ڏي.

(ترجمہ) "جنہیں آپ ابیات سمجھے ہیں وہ آیات (نشانیاں) ہیں، وہ دل کو محبوب سے ملاتی ہیں۔"

حقیقت میں لطیف کی ولولہ انگیز نغمہ سرائیوں کا موضوع انسان کے مرتبے اور موجوداتِ عالم میں اس کے کردار کے بارے میں قرآن کا پیش کردہ اعلیٰ اصول ہے۔ ان کی شاعری عوام الناس کے لیے زبردست اپیل رکھتی ہے، اس لیے کہ وہ اس پیغام کو اپنے عہد کی دیسی زبان کے قالب میں ڈھالتے ہیں اور اس کے حق میں دلائل ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ آسانی سے ان لوگوں کی بھی سمجھ میں آجائیں جو طبقہ خواص کی دانش کے اسرار سے

آگاہ نہیں ہوتے۔

میں سب سے پہلے اس اعلیٰ اصول کے عناصر ترکیب کا ذکر کروں گا جو اس صورت میں آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اول قرآن و حدیث کا محتاط اور بغور مطالعہ کیا جائے اور پھر لطیف کی شاعری سے حسبِ حال اشعار کا حوالہ دے کر یہ دکھایا جائے کہ وہ کس طور پر ان عظیم حقیقتوں کی طرف اپنے عہد کے عام آدمی کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ان کی شاعری عوام الناس کے لیے ہے اور اگر کبھی آپ کو سندھ کے دیہی علاقے کے کسانوں سے بات چیت کا اتفاق ہو تو یہ معلوم کر کے حیران ہونگے کہ لطیف کے اشعار سننے سے انہیں کس قدر رغبت و محبت ہے۔ ایچ۔ ٹی۔ سورلے بھی لطیف کے بارے میں یہی کہتا ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے دیہی علاقے کے لوگوں کے لیے نغمہ سرائی کی ہے۔ بعید از حقیقت نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کے ایک اوسط درجے کے سندھی کے لیے شاہ عبداللطیف کی شاعری کچھ اس قدر فطری ہے جیسی کہ ہوا، جس میں سانس لیتا ہے، اور کیوں نہ ہو، ماں کے دودھ کے ساتھ لطیف کی شاعری بھی اس کے رگوں میں سرایت کر گئی ہے۔

یہ اعلیٰ اصول جو ایک مسلم کے زاویۂ نظر کا تعیّن کرتا ہے، کلمہ شہادۃ **لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ** میں مستحکم طور سے موجود ہے۔ ترجمہ کیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی الہ یا معبود نہیں ہے، سوائے اللہ کے، اور محمد اس کے رسول ہیں۔ اسے یقین کے ساتھ زبان سے ادا کرنے سے ایک شخص احاطۂ اسلام میں داخل ہونے کا استحقاق حاصل کرلیتا ہے۔ لیکن اس بات کا انحصار کہ اللہ کے راستے میں کوئی کس حد تک سفر طئے کرتا ہے اور ان لوگوں کا مرتبہ حاصل کرتا ہے جنہیں مقربون کہہ کر پکارا گیا ہے، منضبط ارادے (جسکا حصول ایک متقی کا جوہر اعلیٰ ہے) اور روشن خیال اندازِ نظر پر ہے جو علم سے حاصل ہوتا ہے۔ عقیدۂ توحید و رسالت اور اسے روبہ عمل لانے کی دیانت خیز حکمت کے سب پہلو، اپنی تمام طیفی رنگارنگیوں کے ساتھ، فقط اسی عنوان شہادۃ کے تنوعات ہیں۔

انسان سے خدا کے رشتے کی مابعد الطبعیاتی اساس کے بارے میں اسلام کی ہدایت

کیا ہے، اسے قرآن مجید کی اس سورۃ میں باآسانی سمجھا جا سکتا ہے جس میں انسان اور مالکِ حقیقی کے مابین عہدِ ازل کا حوالہ ہے:

واِذا اخذ ربك من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم و اشھد ھم علٰی انفسھم الست بربکم قالوا بلٰی شھدنا ان تقولوا یوم القٰیمۃ انا کنا عن ھذا غٰفلین

(سورۃ ۷: آیت ۱۷۲)

(ترجمہ) "اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے (یعنی انکی پیٹھ سے) ان کی نسلوں کو باہر نکالا اور ان کے مقابلے میں خود انہی کو گواہ بنایا (اس طرح پر کہ ان سے پوچھا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب بولے ہاں ہم (اس بات کے) گواہ ہیں (اور اس غرض سے کہ ایسا نہ ہو) کہیں قیامت کے دن تم کہنے لگو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر ہی رہے (یعنی کسی نے ہم کو بتایا نہیں)"۔

آخرت اور یوم قیامت پر عقیدہ لازم ہے انسان کے احساسِ محاسبہ کا جو بالخاصہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ اس سے ان تمام نعمتوں کا حساب لیا جائے گا، جو اسے بخشی گئی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے، کہ سعی و عمل کے سواء اور کچھ بھی انسان کی اپنی ملکیت نہیں۔ قیامت کے دن اس کی قدر و حیثیت کا تعین اس بنا پر کیا جائے گا کہ قانونِ الٰہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس نے کس قدر مخلصانہ کوشش کی۔ اس طور پر یہ زندگی مومن کے لئے ایک آزمائش اور امتحان بن جاتی ہے۔ اسے لازم ہے کہ اپنے اعمالِ حیات کو آگے چل کر اس طرح انجام دے کہ اپنے مالک و آقا کی بندگی کا حق ادا ہو جس نے اسے پیدا کیا۔ اسکے بعد انسان کے تمام اعمال قانون کے مطابق ہونے چاہیں کیوں کہ اس قانون کا نفاذ و اجراء مرضیٔ الٰہی نے کیا ہے۔ اور فی الاصل ہر کام جو وہ کرے یا جس سے بچے مالک حقیقی کے لیے ہونا چاہئے۔ ایک مومن کی حیثیت سے اسے یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ میری عبادت اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، سب خالق حقیقی کے لیے ہے جس کا کوئی ہمسر

نہیں، اور ان سب باتوں کے قبول کرنے کا اسی نے مجھے حکم دیا ہے اور میں نے قبول کیا ہے اور میں مسلمین میں سے ہوں" (إن صلواتي و نسكي و محياى و مماتي لله رب العالمين ○ لا شريك له و هذالك أمرت و إنا من المسلمين). اسلام کا بنیادی اصول پیغمبرؐ کے اس دعوے پر یقین کامل رکھنا ہے کہ من جانب اللہ آپؐ کو الہام کی بنیاد پر انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مبعوث فرمایا گیا ہے جو قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ صحیفہ الٰہی ان چور گڑھوں (پوشیدہ خطرات) کی طرف سے خبردار کرتا ہے جن سے بچ کر چلنا ہے، اور ان معمولات کی نشاندہی کرتا ہے جن کی بجا آوری سے ایک مومن اس دنیا میں ایک بہتر زندگی اور آخرت میں ابدی زندگی کے انعام سے نوازے جانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ان لوگوں کی امتیازی خصوصیات بیان فرمادی گئی ہیں جو صراط مستقیم پر ہیں اور جو اس زندگی میں کامیابی سے نوازے جائیں گے۔ اور وہ امتیازی خصوصیات یہ ہیں :

الذين يؤمنون بالغيب ويقيمون الصلواة ومما رزقنهم ينفقون○
والذين يؤمنون بما انزل اليك وما انزل من قبلك بالآخرة هم
يوقنون○ اولائك على هدىً من ربهم واولئك هم المفلحون○

(ترجمہ) جو غیب پر ایمان لائے اور نماز پڑھتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے (راہ خدا میں بھی) خرچ کرتے ہیں اور (اے پیغمبرؐ) جو (کتاب) تم پر اتری اور جو تم سے پہلے اتریں ان سب پر ایمان لائے اور وہ آخرت کا بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کے سیدھے راستے پر ہیں اور یہی فلاح پائیں گے۔

اب رہی کفر کی حالت جس میں انسان مبتلا ہو سکتا ہے، اس کی نفسیات کی تصویر کشی آیات مذکورہ بالا کے بعد آنے والی ان دو آیات میں کی گئی ہے :

ان الذين كفرو سواءٌ عليهم ءَ انذرتهم ام لم تنذرهم لايؤمنون○

(انہ)

ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃٌ ولھم عذابٌ عیظیم ○

(ترجمہ) "(اے پیغمبرؐ) جن لوگوں نے کفر کیا ان کے حق میں یکساں ہے کہ تم ان کو (عذاب الٰہی سے) ڈراؤ یا نہ ڈراؤ۔ وہ تو ایمان لانے والے ہیں نہیں۔ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اللہ نے مُہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے"۔

یہ حالت کفر ایک ایسا منظر پیش کرتی ہے جس میں ایک منکر خدا کو روحانی طور پر اندھے پن اور بہرے پن کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کی ان آیات کو نہ تو سن سکتا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے اور جو اس کے سامنے اس کی زندگی کے ایسے داخلی اور خارجی معاملات میں پیش فرمائی جاتی ہیں جن سے اس سفر ارضی کے دوران اس پر زندگی کی حدّ و نہایت اور کار منصبی کا مفہوم منکشف ہوتا ہے۔ لیکن، کسی نہ کسی طرح، ان نشانیوں سے صرف نظر کی جسارت کے سبب وہ خود کو ابتری کا شکار بنا لیتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو سفلی جذبات کا محکوم بنالیتا ہے اور اس طور سے وہ اپنے ہی برتاؤ سے اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتا چلا جاتا ہے۔

آخری نکتہ یہ کہ اگر تخلیق انسان کا مظہر اتم اور عطر عطیر نہیں تو جوہر تو یہ ضرور ہے کہ اگرچہ وہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے تاہم خدا نے اس میں اپنی روح بھی پھونکی ہے، اس طرح خدا نے اپنے وجود مطلق کا ایک لافانی اور دائمی عنصر اس میں رکھ دیا ہے اور انسان کی ساخت و پرداخت میں یہ اس عنصر کی موجودگی ہی ہے جو اسے نظام موجودات میں ایک اشرف و اعلیٰ مرتبہ دلاتی ہے۔ اب وہ جس حد تک اس مقدس اصول کو جو اس کے وجود میں مضمر ہے موثر و متحرک کرلے اور اپنی زندگی کی مقتدر ترین حکمراں قوت بنالے، اسی قدر وہ ادنیٰ دھات (مٹی) کو جس سے وہ بنایا گیا ہے، ذکر اللہ کی کیمیا کے ذریعے بدل کر مظہر الٰہی کے مرتبے پر پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ "جب خاک کے قالب میں روح بیدار ہوتی ہے، اس وقت آدمی پیدا ہوتا ہے"۔ اس مرتبے کا آدمی

برگزیدہ بندوں کے گروہ میں داخل کرلیا جاتا ہے اور اس کی رسائی عالمِ محسوسات کے ماورا تک ہو جاتی ہے، ایسا ہی آدمی اقلیمِ نور کو دیکھنے کا شدید آرزومند ہوتا ہے جس کی کہ وہ خود ایک مخلوق ہے۔

اسلام کے اعلیٰ اصول سے متعلق تعلیماتِ اسلامی کا مذکورہ بالا اجمالی بیان ان وسائل کا احاطہ نہیں کرتا جن کی صراحت انسان کو اپنے ارتقا کی رفتار تیز تر کرنے کے قابل بنانے کے لیے مذہبی قانون میں کی گئی ہے۔ یہ وسائل ہیں نماز قائم کرنا، زکواۃ ادا کرنا، ماہِ رمضان کے روزے رکھنا، حج کرنا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن، جیسا کہ کوئی بھی دیکھ سکتا ہے، یہ بھی لازم و ملزم حالتیں ہیں جو اعلیٰ اصول کی پاسداری کے ساتھ بقائے باہم کا رشتہ رکھتی ہیں۔ ایک مومن جو اعلیٰ اصول کی پابندی کا اقرار و اظہار کرتا ہے، بہر طور مراسم دینی کو معمولاً بجا لائے گا کیونکہ اس کی غرض و غایت زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد کی تکمیل کیلئے قوتِ ارادی کو مستحکم بنانا ہے۔

اب، شاہ عبداللطیف کی شاعری اپنے جوہر کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ اصول کا موثر بیان تو ہے بلکہ اسکے قواعد و اعمال پر مضبوطی سے جمے رہنے کی ایک ولولہ خیز وکالت بھی ہے۔ اس اعلیٰ اصول کی ارغوانی روشنی میں، لطیف اپنی روح کی گہرائیوں میں جو کچھ دیکھتے ہیں، جو کچھ سنتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں، اُسے بے شمار طریقوں سے اپنی محبت آمیز نغمہ سرائی کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ ان میں عالمِ ماورا کے اشارات پاتے ہیں، جو ایک قسم کا وسیلہ ہے اقدس المقدسین سے رابطے کا۔

سر کلیان میں، جس سے رسالو (پیغام) کا آغاز ہوتا ہے، ہمیں خدا کی وحدانیت پر، اس کے یکتائی پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر اظہار خیال ملتا ہے۔ اس کے جزو اول ہی میں ان عنوانات سے مطابقت رکھنے والی آیات قرآنی کا حوالہ دیا گیا ہے، اس اسلوب کی وضاحت کے لیے ذیل میں متعلقہ ابیات کا آزاد ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

اللہ اول ہے، علیم ہے، اعلیٰ ہے
وہ سارے عالم (موجودات) کا مالک ہے
وہ قادر ہے، وہ قدیم ہے
وہ اپنی قدرت سے قایم ہے
وہ والی ہے، واحد ہے، وحدہ لاشریک ہے
وہ رازق ہے، رب ہے اور رحیم ہے
اس کی تعریف کرو جو حکیم ہے
اس کی تعریف کرو جو مالکِ حقیقی ہے
اس کا اعتراف کرو جو علتوں کی علت غائی ہے
اور دل کی گہرائیوں سے اس کا اقرار کرو
جو تعریف کیا گیا ہے (یعنی محمد ﷺ)
(اس اقرار کے بعد)
پھر تم جا کر کسی اور کے آگے کیوں جھکتے ہو
جنہوں نے اقرار کیا کہ وہ واحد ہے
اس کا کوئی ہمسر نہیں
جو علتوں کی علتِ غائی ہے
اور دل کی گہرائیوں سے محمد (ﷺ) کو مانا
یہی وہ لوگ ہیں جن کے قدم صراطِ مستقیم سے بھٹکنے نہیں پائے
یہی وہ لوگ ہیں جو تن بریدہ ہیں وحدہ لاشریک کے
الا اللہ نے انہیں دو ٹکڑے کر دیا ہے
ان کشتگانِ وحدت کو دیکھ کر
کون ہے جو کشتہ ہو جانے کی تمنا نہ کرے گا

اس میں اسکی وحدت اور حقیقت آشکارا ہے
لیکن جنھوں نے باطل دوئی کو اختیار کیا
وہ فی الحقیقت زندگی کے ذائقے اور ملاحت سے محروم ہو گئے

انگریزی ترجمے میں اصل ابیات کے حسن اور قوتِ تاثر کو منتقل کر دینا ممکن نہیں، اور پھر اٹھارہویں صدی کی سندھی زبان کا محاورہ بھی ایسا نہیں کہ اسے ایک جدید زبان میں موزوں تصوری چوکھٹا مل جائے جو دقیق دماغی کاوش اور تصنع پسندی کے سبب طولِ کلام اور کثرتِ الفاظ کی طرف رجحان رکھتی ہے۔ وحدت کے موضوع پر (جو ظاہری ثنویت کا وہ پردہ اٹھا کر ہی پہچانی جا سکتی ہے جس نے سارے انسانی علم کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے) اظہارِ خیال کرتے ہوئے لطیف نے جو کچھ تمثیلات پیش کی ہیں تاکہ یہ سمجھایا جا سکے کہ خدا کی وحدانیت کے تصور کا احاطہ بہترین طور پر کس طرح کیا جائے۔ ذیل میں اصولِ وحدت الوجود کے جوہر اور خلاصے کی جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ اصول زیادہ مناسب طور پر شیخ الاکبر ابن العربی کی تعلیمات کے ساتھ مربوط نظر آتا ہے لیکن در حقیقت یہ انسانی ذہن کے ایک قدیم اور غیر منفک رجحان کی عکاسی کرتا ہے، جو نتیجہ ہے وجدانی طور پر اس حقیقت سے آشنا ہو جانے کا کہ وحدت ہی سے کثرت کا ظہور ہوا، اور باوجود ظاہری کثرت کے وحدت ہی حقیقت ہے۔ صداقت، فی الحقیقت بس ایک ہے۔ اس کے اظہار کا کوئی بھی اور طریقہ ایک غلطی ہے جس سے لازماً بچنا چاہئے۔ لطیف کہتے ہیں:

پڙاڏو سو سڏ ور وائِي جو لهين،
هئا اڳهين ڳَڏ ٻڌڻ ۾ ٻه ٿيا.

(ترجمہ)

یہ صدا اور بازگشت صدا اصل دونوں کی ایک جیسی ہے
اپنی آواز کی دوئی پہ نہ جا کہ سماعت فریب دیتی ہے
(شیخ ایاز)

ایڪ قصر در لک. سهسين ڪٽس گڙڪيون.
جيڏانهن ڪريان پرک. تيڏانهن صاحب سامهون.

(ترجمہ)

قصر ہے ایک اور در لاکھوں، ہر طرف بے شمار ہیں روزن
مجھ کو ہر سمت سے نظر آیا، جلوہ گر ایک ہی رخ روشن

(شیخ ایاز)

مشہور و معروف سرماروی میں لطیف عمر ماروی کے قصے کو لیتے ہیں جو ان کے عہد میں یقیناً مروج رہا ہوگا، اور اسے اعلیٰ مفاہیم کی ترسیل کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اس کا پہلا ہی بند، ازل میں انسان اور اس کے خالق کے مابین ہونے والے عہد (عہدِ الست) کی یاد دہانی سے شروع ہوتا ہے جس کا ذکر پیشتر آچکا ہے۔ اس کے بعد ماروُی کے قصے کا اجمالی ذکر ہے جس میں عمر (جس کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ سندھ کا بادشاہ تھا) کے دہقانی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو جانے کا حوالہ ہے جس کا نام ماروی ہے۔ عمر اسے اس چھوٹے سے گاؤں سے، جہاں وہ اپنے فرومایہ لوگوں کے ساتھ رہ رہی تھی، زبردستی اٹھا کر اپنے محل میں لے گیا۔ لیکن پھر، چونکہ پہلے ہی اس کی منگنی اپنے ایک عزیز سے ہو چکی تھی، اس لیے اس نے اغوا کرنے والے کے شاہانہ اقتدار کی قربان گاہ پر اپنی ذات کو حوالے کر دینے اور مغلوب ہو جانے سے انکار کر دیا۔ کئی برس مصائب برداشت کرنے کے بعد جب بادشاہ پر اس کی ثابت قدمی بخوبی واضح ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ یہ اس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس میں مخلصین اور صالحین ڈھالے جاتے ہیں تو اس نے اپنے لوگوں میں واپس چلے جانے کی اجازت دے دی۔ لطیف اس قصے سے اپنی قاری کو انسانی روح کی حالت کی طرف متوجہ کرنے کا کام لیتے ہیں جو خود حیاتِ دنیوی کے قید خانے میں مقید ہے، لیکن چونکہ قدسی الاصل ہے، اس لیے ہمہ وقت رہائی کی تمنائی ہے تاکہ اپنے اصلی گھر کی طرف پلٹ سکے۔ انسان کی روح خود کو انحطاط کے میلے غلاف میں ملفوف پاتی ہے، مزید برآں، اکثر و بیشتر دنیاوی تحریص و ترغیب سے

مغلوب ہو جاتی ہے اور بد راہیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس آلودگی کے باوجود اس کی فطرت ایسی ہے کہ اس کی قدرتی پاکیزگی کامل طور سے کبھی نہیں دھندلاتی، اور یہ عالمِ قدس کو پلٹنے کی متمنی رہتی ہے جو ہمارا اصلی گھر ہے۔ پہلا ہی بیت جس سے سُر ماروی کا آغاز ہوتا ہے قرآن مجید کی آیت پر مبنی ہے :

"الست بربکم" یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔

"الست بربکم"، جڏھن ڪن پيوم،
"قالوا بليٰ" قلب سين، تڏھن تتِ چيوم،
تنھن وير ڪيوم، وچن ويڙھيچن سين۔

ترجمہ :

خدا شاہد ہے جب روحوں نے باہم
کیے روزِ ازل کچھ عہد و پیماں
نہ جانے کیوں اس دن سے ہیں مجھکو
بہت پیارے یہ سب نادار دھقاں
(شیخ ایاز)

اسی عہد و پیماں کے تقدس کے سبب سے ایسا ہوا کہ جب ماروی عمر کے محل میں تھی تو ترغیبات کے نرغے سے مطلق مغلوب نہ ہوئی۔ وہ بہر حال اسی کی وفادار رہی جس کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی تھی۔ ماروی کے مصائب کی کیفیت اور اپنے لوگوں میں واپس جانے کی شدید آرزو کو لطیف نے اپنے نغموں میں ایک ایسی زبان میں ڈھالا ہے جس کا ترجمہ (اسی کیفیت کے ساتھ) ناممکن ہے۔ درج ذیل ایچ۔ ٹی سورلے کے انگریزی ترجمے سے اصل اشعار کی قوتِ تاثر کا کچھ ادھورا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے :

(انگریزی سے ترجمہ) :

قید میری قسمت میں تھی سو ہو کر رہی

ورنہ اس قلعے کی چاردیواری میں کیوں داخل ہوتی

یہ لوح محفوظ کا لکھا تھا جو مجھے یہاں لے آیا

میری جان، میرے جسم اور میرے دل کو کوئی خوشی نہیں

کیونکہ میں اپنی بکریوں کے ریوڑ سے الگ، اور تنہا ہوں

اے مالک یہ حکم قضا تیری ہی مرضی سے ہے

کہ ماروی اپنے ماروؤں کے ساتھ نہ ہو

قید کی زندگی میری قسمت میں لکھی تھی جو مجھے مل کر رہی

یہی میری قسمت میں لکھا تھا کہ میں یہاں مصیبت کی زندگی گذاروں

جیسا کہ الکتاب میں ہے: (ھناک جسمی والفوادلدیکم)

یعنی میرا جسم یہاں ہے اور دل تمہارے ساتھ

کاش قدرت خداوندی ایسا کرے

کہ میں ماروؤں کے ساتھ جاملوں

جس سے مجھے محبت ہے

یہ اٹل قول ہے جسے گرہ میں باندھ لینا چاہیے

جَفَّ القلم بما هُوَ

یعنی تقدیر کا قلم مُقدرات لکھ چکا تو خشک ہو گیا

تقدیر کے قلم سے روانی میں لکھا گیا

کہ مارو صحرا نوردی کریں

جب کہ میں بالائی کمروں میں مقیم ہوں

میں ان تمام جگہوں کو آگ لگادوں گی

انھوں نے میرے دیس کے لوگ مجھ سے چھڑادیئے

میں اپنوں کے لئے دن رات جلتی ہوں

ہر شے اپنی اصل کی طرف پلٹتی ہے
کاش میں بھی اپنے دیس ملیر کو جاؤں
اور اپنوں سے ملوں
ماروی بڑے بڑے کمروں سے پریشان ہے
اور افسردہ ہے، چہرہ پُر ملال ہے
اپنے سوکھے بالوں میں اس نے تیل نہیں لگایا ہے
صدمے کے سبب سے اس کی شانِ حسن لٹ گئی ہے
لطیف کہتا ہے: بادِ سموم نے جب اسکو چھوا
اور خوشیوں کو کافور کی طرح اڑا لے گئے
جن لڑکیوں کے ذہن کچلے گئے ہوں
وہ کیسے مسکرائیں اور سر میں تیل لگائیں
وہ اپنا منہ ملیر کی طرف کرتی ہے
عمر بھر کو رونے اور چیخنے کے لئے
اے سومرو! مجھ میں ماروؤں کا خون ہے
میں زبردستی تیری بیوی نہیں بنوں گی
میں تیرے عیش کو پھانسی کا پھندا سمجھتی ہوں
میرا دل ان لوگوں کی گرفت میں ہے
یہ ان کی محبت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا
وہ تھکی ماندی کھڑی اپنا منہ ملیر کی طرف موڑتی ہے
ماروؤں کی دی ہوئی کملی سنبھالتی ہے
اور کہتی ہے: خبردار! اے سومرو!
ایک باعصمت غلام کو زنجیروں میں نہ جکڑ

میں نے اپنا منہ ملیر کی طرف پھیرا
میں قلعے پر چڑھ گئی
اپنے دیس کی خاطر میرے آنسوؤں کا دریا بہا
میرے دل سے کربناک چیخیں نکلیں
اس کے باوجود، صحرا نشینوں کو
میری بدنصیبی کی خبر نہ ہوئی
اے عمر! وہ بیکس لڑکیاں خود کو
صاف ستھرے لباس سے کیسے آراستہ کر سکتی ہیں
جن کے بے بس شوہر صحرا میں
مصیبت کی رسوائیاں جھیل رہے ہو
اے سومرو! کیا وہ اچھی بیویاں ہو سکتی ہیں
جو اپنے شوہروں سے کیا ہوا عہد توڑ دیں
میں نرم گدوں پر کیسے سو سکتی ہوں
جب کہ شوہر صحرا میں مصیبتیں جھیل رہا ہو
اے سومرو! اپنے سارے میٹھے مشروب اٹھالے جا
تاکہ میں اپنے باپ کے خویش و اقرباء کے درمیان
جا پہنچنے کی پیاس، اور زیادہ شدت سے محسوس کر سکوں

اندازاً نو ایسے قصے ہیں جنہیں لطیف نے اپنی نغمہ سرائی کا موضوع بنایا ہے، اور ان میں سے ہر قصے کے لئے ایک جدا سُر مخصوص کیا گیا ہے۔ ان میں سے سُر ماروی کا حوالہ میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مزید سُروں کا ذکر بھی کر دیا جائے، اور وہ یہ ہیں: سر لیلا چنیسر، سر مومل رانو، سر سسی (جو کم و بیش پانچ متغیر سروں پر مشتمل ہے یعنی سر ابری، معذوری، دیسی، حسینی اور کوہیاری)۔ ان میں سے ہر قصہ فی الاصل مقصود و مطلوب

نہیں بلکہ یہ تو ایک بہانہ ہے اعلیٰ تر مفاہیم کے ابلاغ کا۔ یہاں یہ اشارہ کر دینا بھی بیجا نہ ہو گا کہ لطیف ان قصوں کی اہم تر تفصیلات تک کو بیان نہیں کرتے۔ دراصل وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تفصیلات میرے نغموں کے سامعین کے لئے جانی پہنچانی ہیں۔ وہ محض اس سے سروکار رکھتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کی زندگی کے عمیق تر حقائق اور آخرت سے تعلق کی طرف متوجہ کرنے کیلئے ان قصوں کو استعمال کیا جائے۔ سوھنی مہینوال کا قصہ ایک سندھی یا پنجابی کسان کیلئے اس قدر جانا پہچانا ہے کہ تفصیلات اس کے سامنے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن لطیف کا انداز یہ ہے کہ وہ قصے کے خاص خاص پہلوؤں سے فائدہ اٹھا کر ہمیں اس روحانی سفر کی روداد سناتے ہیں، جو ایک سالک کو منزل الٰہی تک پہنچنے کے لئے طے کرنا ہوتا ہے۔ سالک خدا تک لے جانے والے اس راستے سے گذرتے ہوئے کچھ سنگ میل یا یوں کہیے کہ کچھ منازلِ عقل کا مشاہدہ کرتے ہے، مثلاً شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت۔ اس اعلیٰ وارفع راستے کی یہ تمام تمثیلات اس سیر بین سے لی گئی ہیں جس میں، ایک سادہ لوح لڑکی کو محبت میں پیش آنے والی آرزوؤں اور اذیتوں کے مناظر، مسلسل نظر کے سامنے سے گذر رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے دریا عبور کرتی ہے۔ دریائے سندھ کے پانی کی تند و پر شور طغیانی، اندھیری رات کے خطرات، اور خون خشک کر دینے والے غضبناک طوفانِ برق و باراں کی عکاسی بڑے شاعرانہ کمال اور خوبی کے ساتھ کی گئی ہے۔ سوہنی بپھرے ہوئے دریا میں اتر کر اُس پار جانے لگتی ہے اور سوائے مٹی کے ایک کچے گھڑے کے، اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہوتا، جس کی مدد سے مشکل ہی سے دریا پار جا کر اپنے محبوب سے ملنے کے قابل ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر فی الحقیقت وہ دریا پار کرنے کے لیے اپنے ساتھ پکا گھڑا لے جایا کرتی تھی، لیکن اس مرتبہ گھر میں کسی سازش کی بنا پر چوری چوری وہ بدل دیا گیا ہے۔ کچا گھڑا پانی میں گھل جاتا ہے اور موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ ایچ۔ ٹی۔ سورلے کا مندرجہ ذیل منظوم انگریزی ترجمہ انسان میں جستجو الٰہی کے جذبے کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ محبوب سے ملنے کی توقع رکھنی ہے تو اُس سب سے ہاتھ

اٹھانا کتنا ضروری ہے جس پر اس زندگی میں ہم انحصار کرتے ہیں۔اور حقیقت میں صرف اسی وقت ہم محبوب کی صدائے طلب سن سکتے ہیں جب کہ محبوب تک پہنچانے والے ظاہری وسائل سے ہاتھ اٹھالیا جائے :

(انگریزی سے ترجمہ) :

دریا کے ساحل پر عورتیں کھڑی چلاتی ہیں
او ساہڑ! ساہڑ!
ان میں کچھ کے خیالات ذاتی رنج پر مرکوز ہیں
اور کچھ ہیں جو یہ کہتی ہیں "ہمیں زندگی کی پروا نہیں"
اور بپھرے ہوئے دریا میں کود پڑتی ہیں
حقیقت میں ساہڑ انہی کا ہے
جو خطرہ مول لیکر دریا میں کود پڑیں
ایسی ہی ایک عورت سوھنی بھی ہے
جس نے مٹی کا گھڑا ہاتھ میں لیا اور پانی میں اُتر گئی
پانی اس کے بازوؤں پر سے گذرنے لگا
اور بد نصیب نے منجدھار میں چلا کر ساہڑ سے کہا :
جانِ من! میری طرف پلٹ آ
کہ میں حاسدوں کے حسد کا نشانہ ہوں
کوے درختوں پر آرام کرنے جا بیٹھے تھے
عصر کی نماز کا وقت گذر چکا تھا
اس نے مغرب کی اذان کی آواز سن کر
گھڑا ہاتھ میں لیا
اور اس جگہ کی تلاش میں جانے کے لیے دریا میں اتر گئی

جہاں اس کا محبوب ساہڑ اس کا انتظار کر رہا ہو گا
سوھنی یوں گویا ہوئی : مٹی کے گھڑے نے میری آس بندھائی
کہ میں اپنے قبیلے والوں کو دیکھنے جا سکوں
وہ گھڑا میں کیسے ضائع کر سکتی ہوں
جس پر میری زندگی کا انحصار ہے
یہ ٹوٹا تو زندگی بھی ختم ہے
تاہم بے عقیدہ مایوس نہیں ہونا چاہئے
جیسا کہ کہا گیا ہے : لاتقنطوا من رحمة الله
اس قول کو (سیلاب حیات میں) اپنا بیڑا بنا
یہ تجھے ترائے گا
پھر تو مولا کی مدد سے
اہل محبت کے دلوں میں بسنے والی خوشیوں کے ساتھ
اپنے قبیلے والوں کا چہرہ دیکھ سکے گا
جب گھڑا ٹوٹ گیا اور زندگی تیزی سے ختم پر آ گئی
اور تحفظ حیات کے اسباب معدوم ہو چکے
سوھنی کے کانوں میں قبیلے والوں کی چیخیں
اور قبیلے کی بھینسوں کی آوازیں گونجنے لگیں
سوھنی! اب تحفظ کا خیال دل سے نکال دے
اور خود کو اپنے آپ میں لے جا بغیر کسی وسیلے کے
عشق خود تجھے تند و تیز طوفانی موجوں سے گذرنے کے قابل بنا دیگا
جو عشق کو اپنا رہنما بناتے ہیں
وہ جلد گہرے پانیوں سے پار ہو جاتے ہیں

بغیر کسی وسیلے کے دریا عبور کر جا
کچے گھڑے کو زمین پر پٹک دے اور توڑ ڈال
گھڑے پانیوں میں صرف اشتیاق و محبت کو اپنا رہنما بنا
بے پایاں محبت رکھنے والوں کے لیے بیڑا ایک بوجھ سے کم نہیں
چرواہے کو انہی کی فکر ہوتی ہے جو اسکے لیے سرگرداں ہوں
ایک وقت تھا جب خدائے واحد ولم یزل نے روحوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا
"کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟"
اس وقت، ہاں اس وقت بھی،
سوھنی میں چرواہے کی محبت اور تمنا جاگزیں تھی
یہ خود خدا کی مرضی تھی
کہ پانی کی قوت نے مٹی کے گھڑے کے دو ٹکڑے کر دیئے
مرضیٔ مولیٰ نے اس کی قسمت میں یوں ہی لکھ دیا تھا
اس نے قسمت کے لکھے کو اس دنیا میں پورا کر دکھایا

سر سوھنی کو محققین کی متفقہ رائے کے مطابق رسالو میں آخری سر تسلیم کیا جاتا ہے، اسے وہی درجہ دیا گیا ہے جو Tempest کو شیکسپیر کی فنکاری میں حاصل ہے۔

یہ امر تعجب خیز ہے کہ شاہ عبداللطیف کے اس رسالے میں، جو عام کتابی سائز کے بارہ سو سے زیادہ مطبوع صفحات پر مشتمل ہے اور انسان کے خدا سے رشتے کی حقیقت اعلیٰ کا اتنے متنوع انداز سے اظہار کرتا ہے، سب سے زیادہ دلکش اور دل آویز کردار جن پر شاعر نے توجہ مرکوز کی ہے تمام کے تمام نسوانی ہیں۔ لطیف نے کسی ہیرو کی مرقع کشی نہیں کی۔ ان کی نغمہ سرائی نسوانی مرکزی کرداروں کے لیے مخصوص ہے۔ اور وہ اپنے لیے بھی جنس مونث کے الفاظ لاتے ہیں۔ ہر چند کہ تمام عشقیہ قصوں میں ایک عاشق ہوتا ہے اور ایک محبوب، مگر لطیف کے یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہی بے نظیر عاشق ہے۔ اور یہ اس

عورت کی مضطربانہ تلاش و جستجو کی کیفیت ہے جس کی مرقع کشی کے وہ شدید آرزو مند ہیں۔

سُر ماروی اور سُر سوھنی میں جو مصائب ان ہیروئنوں کو جھیلنے پڑے، یہ ان کی ذمہ داری نہ تھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ایک ایسی قوت کی گرفت میں آگئیں جو ان کی شخصیتوں کو ودیعت کی ہوئی ساری قوتوں سے قوی تر تھی۔ ان کی حالت کچھ ایسی ہے کہ ہمیں المیے کے یونانی تصور کی یاد دلاتی ہے جس میں ہیرو حاسد دیوتاؤں کے ہاتھوں لازمی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دیوتا، جو آدمی کو پھلتا پھولتا اور کامیاب و بامراد دیکھنا نہیں چاہتے۔ سوھنی اور ماروی بھی اپنی المناک حالت کی ذمے داری اس نظریے پر عائد کر سکتی تھیں جس کی عکاسی شیکسپیئر کی اس مشہور تمثیل میں ہوئی ہے:

As flies to wanton boys, are we to the gods,
They kill us for their sport.

تاہم دوسرے اہم سروں مثلاً سسی، اور لیلا چنیسر بلکہ مومل رانو میں بھی۔ تینوں میں ہر ایک ہیروئن خاصے مصائب کا شکار ہوتی ہے، لیکن آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی نہ کسی قصور کی بنا پر ایسا ہوا ہے، جو یا تو ان سے سرزد ہوا یا ان کے کردار میں کوئی ایسی خامی تھی کہ مصائب نے انہیں آدبایا۔ سسی ایک پرجوش اور مستعد عاشق ہونے کے باوجود نیند سے مغلوب ہو جاتی ہے اور اس کے محبوب پنھوں کو اس کے بھائی، چوری چوری، اس سے دور، چھین لے جاتے ہیں۔ آنکھ کھلنے پر اسے نقصان کا پتہ چلتا ہے، یعنی یہ کہ پنھوں اب اس کے پاس نہیں رہا۔ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ اس کے پاس پیروں کے نشانات کے ذریعے کھوج لگانا شروع کرتی ہے۔ اور ننگے پیر ایک ایسا پہاڑی علاقہ پار کرنے کی جان لیوا جسارت کرتی ہے جو بہت سے راستہ روکنے والے معاندانہ عناصر سے پُر ہے۔ پھر لیلا ہے جو قیمتی پتھروں اور زیوروں سے محبت رکھنے کے بنا پر سزا پاتی ہے۔ وہ راجا چنیسر کے ساتھ بیاہی گئی تھی اور خوش و خرم زندگی گذار رہی تھی۔ راجا اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ لیکن کورو نام کی ایک اور خاتون قیمتی پتھروں کے سلسلے میں اس کی کمزوری کو بھانپ لیتی ہے اور اسے ایک خوبصورت ہار دکھا کر تحریص دلاتی ہے۔ اور آخر کار ایسی ترکیب کرتی ہے کہ لیلا

ایک رات کے لیے اس کے ہاتھ چنیسر کو بیچ ڈالتی ہے۔ معاملات اس طرح طے پاتے ہیں کہ جب چنیسر واپس پہنچتا ہے تو بستر عروسی پر لیلا کے بجائے کورو کو پاتا ہے۔ قدرتاً، جب اُسے سازش کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو رانی پر اُسے سخت غصہ آتا ہے، اُسے محل سے نکال دیتا ہے اور وہی جو پہلے رانی تھی اور راجا کی مملوکہ ہر چیز اسکی تھی، اب ایک محتاج و مفلس بھکارن اور موردالزام بیوہ جیسی بن جاتی ہے۔ شاعر اُسے نصیحت آمیز تنبیہ کرتا ہے کہ واپس راجا کے پاس جائے اور اپنے گناہ کا اقرار کر کے اس سے رحم و کرم اور معافی کی طلبگار ہو۔ شاعر کو یقین ہے کہ وہ مقبولِ بارگاہ ہو گی کیونکہ اللہ بڑا رحم والا ہے۔ مومل اور رانو کے قصے میں مومل نے اپنی بہنوں میں سے ایک کو مردانہ لباس پہنایا ہے اور اس کے ساتھ ایک ہی بستر میں سوتی ہے۔ اُسے اس رات رانو کے آنے کی توقع تھی۔ لیکن چونکہ وقوعے کی رات رانو مقررہ وقت پر آنے میں ناکام رہا، اس لیے مومل مایوس اور دل شکستہ ہو کر، اور یہ سوچ کر کے رانو اب اس کے ساتھ باوفا نہیں رہا، اپنے عاشق کے ساتھ ایک ظالمانہ چال کھیلتی ہے۔ وہ اپنی بہنوں میں سے ایک کو رانو کی طرح لباس پہناتی ہے اور اپنے ساتھ اسی بستر پر سلاتی ہے۔ رانو تاخیر سے پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ دو جسم ایک ہی بستر پر محوِ خواب ہیں۔ اس نے سوچا کہ مومل کا کوئی اور عاشق بھی ہے۔ انتہائی نفرت اور غصے کی حالت میں رانو وہاں سے چلا آیا اور بطور نشانی بستر پر ایک چھڑی رکھ دی تاکہ بیدار ہونے پر مومل حقیقت جان لے۔ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ چال چلنے والے پر ہی چال اُلٹ گئی اور وہی اپنی چال کا نشانہ بن گیا۔ مومل کو اپنی ہی سازش کے سبب سے خاصی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

ان مذکورہ بالا تینوں حالتوں میں، شیکسپیئر کے مشہور نقاد بریڈلے کے الفاظ میں، کوئی "تقدیری سُقم" ہے جس کی بدولت یہ ہیروئنیں مصائب کی زد میں آگئی ہیں۔ آخرالامر جو کچھ فعل یہ کرتی ہیں وہی ان کے مصائب کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ ان کے معاملے میں کردار ہی ان کی تقدیر ہے یعنی جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

اس سیاق و سباق میں سُر سورٹھ کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں

لطیف نے سالک اور مرشدِ روحانی کے رشتے کو اپنے ابیات کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ایک ایسے موسیقار کا قصہ ہے جس نے اِس کام کا بیڑا اٹھایا کہ ایک کریم النفس راجا، رائے ڈیاچ کا سر لائے گا اور راجا آنی رائے کو پیش کرے گا جو رائے ڈیاچ کے حریفوں میں سے تھا، اپنی موسیقی کے بل پر وہ موسیقار اس کام کے کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس نے رائے ڈیاچ کے سامنے فنِ موسیقی کا مظاہرہ اس وقت شروع کیا جب کہ وہ گرنار پہاڑ کی چوٹی پر چالیس دن کے لیے عارضی طور پر مقیم تھا، کیونکہ نجومیوں کی پیشن گوئی کے مطابق انہی چالیس نازک دنوں میں اسکے قتل کا امکان تھا۔ بیجل نام کا یہ موسیقار مسلسل چالیس روز تک دن رات اپنے فنِ موسیقی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ راجا اسکے گانے سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے موسیقار سے کہا "مانگ کیا مانگتا ہے، جو مانگے گا، ملیگا۔" بیجل نے اس کا سر طلب کیا۔ چونکہ راجا پہلے ہی وچن دے چکا تھا کہ جو بیجل مانگے گا دوں گا، اس لیے اپنے ہاتھ سے اس نے اپنا سر کاٹا اور موسیقار کو دے دیا۔ اگرچہ یہاں قصے کا عنوان سورٹھ ہے۔ (یہ آنی رائے کی خوبصورت بیٹی کا نام تھا جس کے بہت سے ہمعصر شاہزادے خواستگار تھے اور آنی رائے نے یہ شرط رکھی تھی کہ جو رائے ڈیاچ کا سر لائے گا اس سے سورٹھ کی شادی کروں گا)، لیکن اس قصے میں سورٹھ کا کچھ زیادہ حصہ نہیں۔ علیٰ ہذا یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ بیجل کیسے ہیرو قرار دیا جا سکتا ہے جو موسیقی کے بل پر ایک کریم النفس راجا کا سَر کاٹ لانے کے وحشیانہ اور قابلِ نفرت گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ البتہ رائے ڈیاچ کو ہیرو سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس نے ایک سالک کا کردار پیش کیا، اور موسیقار کی (جسے اس کا روحانی مرشد کہنا چاہیئے) کامل اطاعت کی۔ اس سر کے ابیات میں سے ایک کا ترجمہ، مترجمہ ایچ۔ ٹی۔ سورلے، ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

(انگریزی سے ترجمہ) :

اللہ کے بھروسے پر وہ موسیقار یہاں سے چلا
سارنگی سے آراستہ ہو کر، جسے وہ بجاتا تھا
دور سے اس نے رائے ڈیاچ کی شاہی پالکی دیکھی

دیکھتے ہی، اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ
خدائے واحد سے دعا مانگنی شروع کی :
"اے رحمان ورحیم مولیٰ! اپنے کرم سے
راجا کو میرے گانے کا شایق بنادے"
راجا گانا سن کر انتہائی محظوظ ہوا
ایسا محسوس کیا جیسے اپنے سرخ جھولے میں بیٹھا جھول رہا ہو
اس نے پکار کر کہا : "مقدس گویئے شاعر آگے آ، جہاں صاف جگہ ہے
میں تیری قدموں میں سیم وزر کا ڈھیر لگا دوں گا"
ادھر آ! میں تیری خواہش پر اپنا سر نچھاور کر دوں گا
کچھ لوگوں کا ادراک ایسا قوی ہوتا ہے
کہ وہ زندگی کے عظیم راز تک پہنچ جاتے ہیں
اس راز کو پاکر وہ مخفی امور کی حکمتوں کے حامل بن جاتے ہیں
جس کا سراغ اس قول میں پوشیدہ ہے :
"انسان میرا بھید ہے اور میں اس کا"
یہی قول سرِ حیات کی کنجی ہے۔
اسی کو موسیقار نے راجا کے سامنے گانا شروع کیا
جس کے اثر سے ثنویت احدیت میں بدل گئی
راجا کے حضور میں، تاروں کو درست کر کے
ماہر موسیقار نے عجب مؤثر آواز کے آلات موسیقی چھیڑے
جب اس نے نظر جما کر دیکھا
تو ذیاچ پر واضح اور نمایاں طور سے
معنی کی قوت ظاہر ہو گئی

موسیقار نے چھری نکالی، اور اسے
ڈیاچ کے کاسۂ سر میں گہرا اُتار دیا
گرنار کا پھول شاخ سے توڑ لیا گیا
نوحہ و ماتم کرنے والی عورتیں آہ وزاری کرنے لگیں
سورٹھ جیسی سیکڑوں کھڑی گریہ و بکا کرتی ہیں
تاج شاہی سے مزین اور سنوارے ہوئے بالوں والا سر
انہوں نے موسیقار کے حوالے کر دیا
کربناک چیخوں کے ساتھ ماتم کرنے والیوں کی زبان پہ یہ فقرہ ہے :
"گذشتہ شب راجا نے انتقال کیا"

میں نے آپ کے سامنے ان طریقوں کا کچھ خاکہ پیش کیا جو شاہ عبداللطیف نے سندھ کے عام لوگوں کی گفتگوؤں کا موضوع بننے والے قصوں کو استعمال کرنے میں اس غرض سے اپنائے ہیں کہ ان کے ذریعے لوگوں میں ایک نیا مفہوم اور نئے معنی پھیلا سکیں۔

یہ بلکل وہی کام ہے جو بلند پایا مصنفین ماضی میں انجام دے چکے ہیں۔ مثال میں شیکسپیئر کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے قدیم قصوں سے، بالخصوص ھالن شیڈ کے وقائع اسکاٹ لینڈ سے اسی نوعیت کا کام لیا ہے۔ اسی طرح، گوئٹے نے بھی فاؤسٹ سے متعلق ایک قدیم داستان کو لیا اور اسے انسان کے خدا کے عھدِ ازل کو نئے مفہوم کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ڈرامے کے قالب میں ڈھالا۔ لیکن غلط فہمیوں سے بچنے کے لئے یہ صراحت ضروری ہے کہ رائج الوقت قصوں اور داستانوں کو محض ایک جدید قالب میں ڈھالنے کے مقابلے میں شاہ عبداللطیف کی شاعری کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے۔ انھوں نے عوم الناس کی زندگیوں میں پیش آنے والے مانوس تجربات کو لیا اور ان کے ذریعے ماحیت اشیا کے بارے میں تعبیرات کی وضاحت کی۔ سُر کاپائتی ہی کی مثال لیجئے جس میں لطیف ایک سوت کاتنے والے پیشے کو موضوع بناتے ہیں جو چرخہ چلا کر سوت کاتنے میں اور کپڑا بننے میں مشغول ہے۔ سوت کاتنے

والے کے اس مانوس پیشے کے ذکر سے انکا منشا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اصل چیز کسی خدمت کے لئے خود کو وقف کر دینے کا جذبہ ہے، نہ کہ محض چابک دستی سے سوت کات لینا۔ محتسب جو ہماری مصنوعات کو بازار میں فروخت کے لئے قطعی منظوری دیتے ہیں، جانچ پرکھ کا اپنا ایک جدا طریقہ رکھتے ہیں جس کے مطابق وہ ہمارے کام کی اچھائی برائی اور قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ کاتنے والے نے دل میں محبت کے جذبے کے ساتھ سوت کاتا ہو تو بھدا اور نا ہموار ہونے کے باوجود قبول کر لیا جاتا ہے، لیکن دل میں نفرت کے جذبے کے ساتھ کاتا ہو تو ایسے کارکن کا نفیس سوت بھی مسترد کر دیا جاتا ہے۔ علیٰ ھذا سر سامونڈی میں ملاحوں اور بحر نوردوں کی زندگیوں کو موضوع بنایا ہے کو کھلے سمندروں میں اپنے اپنے سفر کے غیر طے شدہ راستوں سے نمٹنے کو کشتیوں پر نکل جاتے ہیں۔ شاہ لطیف کا مندرجہ ذیل بیت گوئٹے کے ایک شعر کی یاد دلاتا ہے۔ لطیف سمندر میں جانے والے کو متنبہ کرتے ہیں کے اپنی چھوٹی سی کشتی کو سمندری پانی کی مستقل زد سے بچانے کے لیے روزانہ تیل لگانا نہ بھولے۔ گوئٹے بھی بعینہ اپنے ایک شعر میں یہی بات کہتا ہے: "وہ ہی شخص آزادی اور زندگی سے بہرہ ور ہوتا ہے جو روزانہ انھیں از سر نو جیتے"۔ اور اب ملاحظہ ہو لطیف کا وہ حیرت انگیز بیت جس کا ترجمہ انگیریزی میں محض ناکافی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے:

(انگریزی سے ترجمہ):

اے کہ تو لوگوں کو دریا کے پار اُتار لے جاتا ہے
مجھے بھی میرے محبوب سے ملادے
اے میر بحر میں تیرے حجرۂ جہاز کے دروازے پر ایستادہ ہوں
تاکہ تیرے قدموں میں سجدے گذار سکوں

اسی طور سے وہ شمع و پروانہ، کو بھی موضوع بناتے ہیں اور انکے رسالو میں ایک پورا باب ہے جس میں شمع کے بہت قریب آنے کی صورت میں جل کر خاک ہو جانے کے خطرے کے باوجود، شمع کی طرف پروانے کے کھنچنے کے فلسفیانہ معنی خیزی کو موضوع بنایا

ہے۔

وقت نہیں ہے کہ میں لطیف کے کسی مخصوص سُر کا عمیق جائزہ پیش کر سکوں۔ اس کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جس میں جائزہ لیا جا سکے کہ ان کے وہ مخصوص آدب فن کیا ہیں جن کے ذریعے اشیا کے نا قابلِ ابلاغ مفاھیم و معانی کا ابلاغ کرتے ہیں۔ اگر ایک فلسفی کا کار منصبی یہ ہے کہ وہ زندگی کو تسلسل کے ساتھ اور بحثیت کل دیکھنے کی صلاحیت سے مزین ہو تو لطیف کی شاعری کا ہر سُر اس دعوے کا ثبوت فراہم کرتا ہوا معلوم ہو گا کہ ایک ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ لطیف ایک عظیم فلسفی بھی تھے۔

اوّل اللہ علیم، اعلیٰ، عالم کا دھنی
قادر اپنی قدرت سے، قائم اور قدیم
والی، واحد، وحدہ، رازق، رب، رحیم
مدحت کر اس سچے رب کی، کہہ کر حمد حکیم
وہ والی، وہ کریم، جگ کے کام سنوارے
(شاہؒ)

شیخ ایاز

فکرِ لطیفؒ

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں اس شخصیت کے حضور آج اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر رہا ہوں جو میری روح کا استعارہ ہے۔ جس کے افکار میرے شعور کی روشنی اور جس کے نغمے میرے دل کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ اور ایک میں ہی نہیں، سندھ کی زمین کا ذرہ ذرہ اسی آفتاب سے جگمگا رہا ہے۔ شاہ بھٹائی کی آواز محد سے لحد تک ہمارے وجود میں گونجتی رہتی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں شاہ بھٹائی کے فلسفیانہ افکار میں سفر کروں، اپنی اور ہم سب کی ایک ایسی کوتاہی اور کم بینی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو ہماری قومی بدنصیبی کے مترادف ہے۔ ہم لوگ اس وقت تک اپنی عظمتوں کے معترف نہیں ہوتے جب تک نگاہِ غیر ہمیں احساس نہیں دلاتی۔ یہ قدر ناشناسی ہماری ہی نہیں بلکہ کم و بیش پورے مشرق کی ہے۔ ہم نے عمر خیام کی آفاقی عظمت کو اس وقت پہچانا جب Fitz Gerald نے اسکے آگے سر جھکا دیا۔ کالیداس کے اس وقت معترف ہوئے جب Max Muller نے اعتراف کیا اور اسی طرح شاہ لطیف اور ٹیگور کی بلند مقامی کو اس وقت سر اٹھا کر دیکھا جب Sorley اور Yeats نے ان کے قد قامت کی جھلک دکھائی۔ بالخصوص شاہ لطیف کو عرصے تک مقامیت کے حصار میں بند رکھا گیا جب کہ وہ جغرافیائی حدود کے باہر کا انسان تھا۔ اس اجلاس میں، میں یہ بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زبان تو افکار کا محض لباس ہوتی ہے اور لباس تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ شاہ کے افکار جس زبان میں بھی منتقل ہوں گے وہ اسے نئی بلندیاں اور نئی

خطبۂ صدارت پاکستان فلسفہ کانفرنس منعقدہ اسلام آباد ۳۰ مئی ۱۹۷۹ء

وسعتیں عطا کر دیں گے۔ سقراط سے لیکر آئنسٹائن تک، ہومر سے لیکر ٹی ایس ایلیٹ تک جتنے بھی فلسفی اور ادیب گذرے ہیں، ان کے افکار ہی سے ہماری زبانوں کا معیار بلند ہوا ہے۔ اگر ہم زباں کے دائرے کو وسیع نہ کریں تو اپنی ذات میں سکڑ کر رہ جائیں گے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم دوسروں کی عظمت کو پہچانیں۔ مغرب کو ہم پر یہی فوقیت حاصل ہے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے، ہر وقت دوسرے کی نگاہ کے محتاج رہتے ہیں، شاید اس کی وجہ وہ احساس کمتری ہو جو صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہے۔ ہمارے تہذیبی زوال کا ایک محرک خود بینی و خود اعتمادی کا یہ فقدان بھی ہے حالانکہ ہر بڑا آدمی ایک خاص انداز میں اپنی پہچان بتا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

من نوائے شاعرِ فرداستم

غالب نے کہا تھا:

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

میر نے کہا تھا:

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔

شاہ لطیف کی صحبت سے بھی دو سو سال فیض یاب ہونے کے باوجود ہم نے ان کی عظمت کو ان کے کنایوں سے نہیں جانا بلکہ H.T. Sorley کے احسان مند ہوئے۔

شاہ صاحب نے ایک جگہ اپنے بارے میں کہا تھا:

مرے ابیات پر معنی کی کیا بات
شگفتہ صورتِ آیات قرآں
دل انسان پہ کھلتے جا رہے ہیں
رموز معرفت، اسرار عرفاں
(ترجمہ۔ شیخ ایاز)

ان کا کلام آج بھی رموز معرفت اور اسرار عرفاں کا آئینہ ہے، صرف اس نگاہ کی ضرورت ہے جو اس آئینے میں اتر کر دیکھ سکے۔

شاہ صاحب کا بنیادی مسلک تصوف ہے۔ تصوف اور فلسفے میں وہی تعلق ہے جو دل و دماغ میں ہے۔ ایک حقیقت کو پانے کا وجدانی عمل ہے اور دوسرا عقلی، لیکن افلاطون اور ارسطو سے لیکر محی الدین ابن العربی اور امام غزالی تک فلسفہ اور تصوف کے جو رشتے باہم استوار ہوئے ہیں وہ دل و دماغ کو ایک ہی منزل پر لے آتے ہیں۔ بالخصوص اسلامی تصوف میں فلسفہ کوئی علیحدہ قدر کی حیثیت سے باقی نہیں رہتا بلکہ دونوں یک جان و یک قالب ہو جاتے ہیں۔ اور شاہ صاحب نے جو اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر اور بڑے موسیقار بھی تھے اپنے وجدان اور تفکر کو شریعت اور غنائیت میں اسطرح سمو دیا ہے کہ دوئی ختم ہو گئی اور تاثر کی ایک ایسی وحدت نے جنم لیا جو اپنی جگہ ایک کل کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاہ صاحب کے فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار کلی طور پر ایک آھنگ اور ایک لَے میں سمٹے ہوئے ہیں۔ اس لَے میں تمام رنگوں کا فشار موجود ہے، تمام جذبوں کا تلاطم موجزن ہے، تمام محسوسات کی سطحیں نمایاں ہیں، مگر یوں جس طرح کئی دریا ایک سمندر میں گر کر خود ایک بحرِ بیکراں بن جاتے ہیں۔

شاہ لطیف کی شخصیت بھی ایک ایسی ہی مکمل شخصیت ہے، دو سو سال سے سندھی شاعری ان کے جامِ چشیدہ سے سرمست رہی ہے۔ زماں کے بعد نے ہمارا رشتہ ان سے منقطع نہیں کیا اور اِس دور کے مسائل حیات اور تصورِ مستقبل میں وہ ایک بوئے آوارہ کی طرح ہمارے ہم سفر ہیں۔ اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں جہاں ماضی کی اقدار منتشر ہو چکی ہیں، شاہ لطیف کا تصورِ حیات اتنا ہی شگفتہ ہے جتنا کے دو سو سال پہلے تھا۔

مولانا غلام رسول مہر نے شاہ صاحب کی ولادت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں ایک خاص نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے:

"شاہ صاحب سنہ ۱۱۰۱ھ یعنی سنہ ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ گویا ان کی ولادت بارہویں

صدی ہجری کے عین آغاز میں ہوئی۔ عوام کے عقیدے کے مطابق صدی کے عین آخر پر مجدد پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کو کوئی شخص بہ اصطلاحِ معروف "مجدد" مانے یا نہ مانے لیکن اِس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری سے سندھی زبان کو زندہ کر دیا۔ ان کی تعلیم ارباب معرفت کی تعلیم تھی جو اپنی ہمہ گیری کہ باعث زمان و مکان کی قیود سے بالا ہوتے ہیں، جس کے مخاطب محض وہ لوگ نہیں ہوتے جو صاحبانِ تعلیم کے گرد و پیش نظر آتے ہیں بلکہ جس کے مخاطب ہر عہد، ہر ملک اور ہر قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ ان کی زبان پر جو کچھ جاری ہوتا ہے، وہ انسانیت کا درس ہوتا ہے، آفاقیت کا وعظ ہوتا ہے۔ وہ مردم گری کے سانچے تیار کرتے ہیں اور انسانوں کو بہتر انسان بناتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ان میں فرائض کو پورا کرنے کا شوق اور ولولہ پیدا کر دیتے ہیں جن کے لئے خدا پیغمبروں کو دنیا میں بھیجتا ہے"

اس اقتباس کی روشنی میں شاہ صاحب کے دور اور ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو بلا شبہ ان کی شخصیت "پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" کے مصداق نظر آتی ہے

علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

شاہ صاحب بھی رموزِ حیات وہ اسرارِ کائنات کے ایک ایسے ہی محرم تھے۔ انہوں نے بھی انکشافِ حقیقت کے لئے شاعری کو وسیلہ بنایا تھا۔ بقولِ میر:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اور اس فن کو ہر عظیم شاعر کی طرح، شاہ صاحب نے اپنے افکار سے مالا مال کر دیا۔

شاہ صاحب نے بیان و اظہار کا جو قرینہ سندھی شاعری کو عطا کیا، اس کی سب سے

بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہیں پیوند کاری نظر نہیں آتی۔ انہوں نے جتنے الفاظ، جتنے محاورے اور جتنے استعارے استعمال کیئے وہ اسی سر زمین کے دامن سے چنے۔ انہوں نے اپنی سر زمین کی تہذیب و تاریخ کو اپنی ذات میں جذب کیا، اس زمین پر بسنے والے انسانوں کے دلوں میں جھانکا، انکے دکھ سکھ کو سمیٹا، ان کے خوابوں کو اپنی آنکھوں میں بسایا اور اپنی شاعری کو ان کی تعبیر کا آئینہ بنادیا۔

اس مقصد کے لئے انہوں نے تمثیلی پیرایۂ اظہار اختیار کیا اور جیتے جاگتے کرداروں کی معرفت اپنی بات دوسروں تک پہنچائی۔ یہ کردار جو انہوں نے اپنے علاقے کی لوک کہانیوں سے منتخب کیئے، استعاروں اور علامتوں کے طور پر ان کے کلام میں نمایاں ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی شاعری میں مقامیت کو اس لیے برتا ہے کہ ان کے خیالات کی فضا اجنبیت اور بیگانگی کی شکار نہ ہو اور زندگی کی فلسفیانہ حقیقتیں، مانوس کیفیت اور محسوس انداز میں، زیادہ مؤثر طور پر واضح ہو سکیں۔ شاہ صاحب کا روئے سخن براہ راست عوام سے تھا اس لئے انہوں نے الفاظ کے انتخاب میں عوامی ذہن اور عوامی روایات کو بھی پیش نظر رکھا اور ایک مخصوص غنائیت سے اپنے کلام کو ہم آہنگ کیا تاکہ پڑھنے والا وجد میں آکر گانے لگے اور انکا پیغام، نغمۂ روح بن کر دل کی دھڑکن میں سما جائے۔

شاہ صاحب کے مخاطب عوام تھے۔ وہ عوام کو بتانا چاہتے تھے کہ حقیقت ظاہر کیا ہوتی ہے اور حقیقت باطن کیا۔ شاہ صاحب دونوں حقیقتوں کا ادراک رکھتے تھے۔ ان کی نظر نہ صرف اپنے دور کی تاریخ اور معاشرت پر تھی بلکہ ان پسِ پردہ محرکات پر بھی جو تاریخ کے دھارے کا رخ متعین کرتے ہیں اور معاشرے کی اجتماعی روح کو رفتہ رفتہ اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کا زوال، نادر شاہ درانی کا حملہ، مغربی اقوام کی مداخلت اور مقامی حکمرانوں کی خانہ جنگیاں۔ شاہ صاحب کے عہد کو ایک ہمہ گیر طوفان کی زد میں لئے ہوئے تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اب یہ طوفان تہذیب، تمدن اور تاریخ کی ہر روایت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور اتنی دور لے جاکر پاش پاش کر دے گا پھر اس کا کوئی ریزہ بھی ہاتھ نہ آسکے گا۔

حقیقت ظاہر کی یہ ٹوٹ پھوٹ ممکن ہے کہ حقیقت باطن کو بھی پارہ پارہ کر دے۔ شاہ صاحب نے روح کی دنیا کو روشن کر دیا اور اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے جسموں کو تصوف کی معرفت عرفان کے اجالے میں لے آئے۔

شاہ صاحب صوفی شاعر تھے لیکن وہ تصوف کے اس مسلک کے قائل نہیں تھے جو انسان کو تارک الدنیا بنا دیتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسکے بر عکس زندگی کو قبول کرنے کی تعلیم دی ہے۔ وہ ترک کے بجائے "طلب" کے طرف دار ہیں۔ انکے خیال میں "طلب" ایک متحرک، روح افروز اور انہماک آفرین عمل ہے۔ کسی چیز کو تلاش کرنے میں جو انتظار، لگن اور اضطراب ہوتا ہے وہ اس خوشی سے کم ولولہ انگیز نہیں جو اسکو حاصل کرنے پر میسر آتی ہے۔

اولین دور کے صوفیائے کرام اس دنیا کو معمورۂ شر سمجھتے تھے۔ چنانچہ رد عمل کے طور پر اُن کا فیصلہ تھا کہ روحانی توانائی اور حصولِ خیر کے لئے اس دنیا سے کنارہ کش رہا جائے۔ لیکن ابن العربی جیسے جلیل القدر مفکرین نے اِس رد عمل سے انحراف کیا اور منطقی طور پر عام مادی و روحانی تعلق کو اتنی خوش اسلوبی سے فلسفۂ جدید کی روشنی میں بیان کیا کہ بعد کے مفکرین اور صوفیائے کرام ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

شاہ لطیف نے محی الدین ابن العربی وغیرہ کی فکری تجدید کا جو اثر مثنوی رومی کے توسل سے قبول کیا اس کی کوئی واضع مثال نظر نہیں آتی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ زندگی کو ایک سلسلۂ لامتناہی سمجھتے تھے ان کے خیال میں حیات و ممات صرف درمیانی مراحل ہیں۔ ورنہ انسانی زندگی کی نہ کوئی واضع ابتدا ہے نہ انتہا۔

بعض اوقات شاہ لطیف زندگی اور موت کو کچھ اس طرح بھی تصور کرتے ہیں گویا وہ شعور اور لاشعور کے ملتے جلتے دو علیحدہ نفسی وجود ہیں۔ شاہ کا خیال ہے کہ شعوری زندگی ماحول کی دشواریوں سے گھبراتی ہے اس لئے اس کی سعی و کوشش بالعموم نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتی۔ اسکے بر عکس وجود کو اپنے نصب العین میں جذب کر لینے سے دشواریوں کا مطلق

احساس یں ہوتا اور انسان سخت سے سخت مرحلے سے بھی سبکسارانہ گذر جاتا ہے۔ دو حقیقتوں کے انجذاب سے جو اکائی وجود میں آتی ہے وہ ایک ایسے والہانہ عشق سے سرشار ہوتی ہے جسے ''جنونِ خرد'' کی انتہا کہا جائے تو شائد غلط نہ ہو۔ اس عالم میں نہ وقت سدراہ ہوتا ہے نہ وسعتوں کا احساس۔ طول و عرض سمٹ کر فاصلہ یک گام بن جاتے ہیں اور بقول غالب ''دشت امکاں'' ایک ''نقش پا'' ہو کر رہ جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے کلام میں یہ والہانہ روحانی کیفیت تصوف سے گہری وابستگی کی مرہون منت ہے۔ مولانا رومیؒ بھی اسی آئینے میں اسرار حق جلوہ گر دیکھتے ہیں اور شاہ بھٹائی بھی۔ مولانا رومی سے شاہ بھٹائی کی عقیدت کا جواز بھی یہی ہے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ دونوں ایک ہی سمندر کے غواص ہیں، دونوں کی شاعری سچے موتیوں کی تلاش کا ایک والہانہ عمل ہے جسے انکے اسلوب شعری نے اپنی اپنی جگہ منفرد بنادیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مولانا رومی نے ایک نکتے کو بیان کرنے کے لئے ایک کہانی تخلیق کی اور شاہ بھٹائی نے عوامی کہانیوں اور ان کے کرداروں کے عمل میں ایک نکتہ تلاش کیا اور اس عمل کی مختلف جہتوں کو استعاروں اور علامتوں کے طور پر اپنی شاعری میں استعمال کیا۔ اس طرح شاہ نے در پردہ حقیقتوں کا انکشاف کیا۔

شاہ صاحب کی پوری شاعری تلاش و جستجو کی شاعری ہے۔ اپنے مسلک کے اظہار کے لئے انہوں نے جو کردار چنے ہیں، ان کی تخصیص سے بھی، زندگی کے بارے میں ان کے نقطہ نگاہ کا سراغ ملتا ہے۔ ان کے اکثر کردار نسائی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انھوں نے نسائی کردار کیوں منتخب کیے ہیں؟

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان کا تصوف ''ترک'' کا درس نہیں دیتا۔ وہ ''طلب'' کے جویا ہیں۔ اور طلب کے لئے عمل اور پیہم عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ سندھی لوک کہانیوں میں نسائی کردار زیادہ فعال اور متحرک ہیں۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت جبر اور محرومی کی علامت ہے اور تیسرا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ

شدت احساس کے باوجود عورت، زندگی کو اپنے تمام عذابوں کے ساتھ قبول کرنے کا استعارہ ہے۔ اسکے برعکس ان کہانیوں میں مرد کا کردار اتنا فعال، اتنا حساس اور اتنا مجروح نہیں آتا۔ شاید اسکی وجہ معاشرے میں مرد کے مقام اور اسکے عمل اور رد عمل میں پوشیدہ ہو۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہر المیہ داستان میں بہ نسبت مرد کے، عورت ایک زندہ حقیقت کیوں بن جاتی ہے۔

شاہ صاحب نے چونکہ ردو قبول کی کشاکش میں زندگی کو اپنانے کا درس دیا ہے اس لئے لوک کہانیوں کے نسائی کردار ہی ان کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کر سکتے تھے اور انھیں کرداروں کے نفسیاتی مطالعہ کی روشنی میں وہ اس حقیقت کا انکشاف کر سکتے تھے کہ زندگی طلب کا نام ہے، جستجو کا نام ہے، جبر سے رہائی کا نام ہے، اس عشق کا نام ہے جو اپنے آدرش کو اپنی روح میں جذب کر لینے سے پیدا ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے کلام کا سب سے روشن رخ یہی ہے کہ ان کا تصورِ حیات خلا میں معلق نہیں ہے۔ وہ حقیقت کی جستجو میں روح کی تجسیم کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ زندگی کو ایک محسوس پیکر کے روپ میں دیکھتے ہیں اور اقدارِ حیات کو، جذبات کی حدت سے ایک زندہ قوت بنا دیتے ہیں۔

ماروی کا غم ان کی شاعری میں وطن پرستی کا شعلۂ سرکش بن کر نمودار ہوتا ہے تو سسی کا دکھ طلب کا دشت بیکراں بن کر پھیل جاتا ہے۔ لیلاں کے آنسوؤں میں کھوئی ہوئی شے کی جستجو سرگرداں نظر آتی ہے تو نوری کے پیکر میں وفا کا نور مجسم ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے ان محسوس پیکروں کی نہ صرف داخلی تصویر کشی کی ہے بلکہ ان کے خارجی عوامل کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ وہ انسان اور زندگی کے زمینی رشتے کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ وہ ان تمام محرکات کا بھی بغور مطالعہ کرتے ہیں جو معاشرے کے مختلف مسائل کا سبب ہیں۔ انسانی فطرت کے جتنے بھی رخ دیکھے جا سکتے ہیں، شاہ صاحب ان پر روشنی ڈالتے ہیں تاکہ وہ نمایاں ہو جائیں۔ ان کی شاعری میں زندگی مجرد حقیقت نہیں بلکہ ایک محسوس

حقیقت بن کر نمایاں ہوتی ہے چنانچہ ان کے اشعار میں جہاں لہلہاتے کھیت، سر سبز و شاداب چراگاہیں، اونچے نیچے پہاڑ، سنسان گھنے جنگل، رواں دواں دریا، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے اور ایسے صد ہزار مناظرِ قدرت اپنے جلال و جمال کے نیرنگیوں کے ساتھ رنگ بکھیرتے اور جگمگاتے ملیں گے وہاں مچھیروں، ملاحوں، دھونی رمائے سادھوؤں، حجرہ نشیں صوفیوں اور راج محل میں زندگی گذارنے والے تاجداروں کے تابناک اور کجلائے ہوئے چہرے بھی نظر آئیں گے جن کی پیشانیوں پر وقت نے اپنی تاریخ لکھ دی ہے۔

شاہ صاحب اس تاریخ کے ایسے مورخ نہیں جو صرف حروف پڑھتا ہے اور انہیں صفحۂ قرطاس پر نقل کر دیتا ہے۔ شاہ صاحب نے ایک عظیم مفکر کی طرح اپنے عہد کی تاریخ کا مطالعہ بین السطور میں کیا ہے کہ کیونکہ تاریخ بین السطور ہی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کے کسی بیت کو اٹھالیجیے، وہ بظاہر ایک کردار کے ایک لمحے کا اظہار ہے لیکن در حقیقت وہ لمحہ پورے عہد پر محیط ملے گا۔ اس عہد کے ہر انسان کا المیہ محسوس ہوگا اور جب ہم اسے وقت کے قید سے آزاد دیکھیں گے تو وہ ہر دور کے ہر انسان کے دل کی دھڑکن میں گونجتا ہوا دکھائی دے گا۔ تاثر کی یہ ہدایت انسانی فطرت کے گہرے اور اسکے اظہار کی غیر معمولی صلاحیت و قدرت کے بغیر کسی تحریر میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسکے علاوہ اُس بنیادی صداقت کا ادراک بھی اس ابدیت کا لازمی عنصر ہے جو صرف ایک بڑے شاعر، ایک بڑے ادیب اور ایک بڑے مفکر ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اُسکی نظر صرف خارجی عوامل پر نہیں رہتی بلکہ پیش منظر سے پرے، آنکھ او جھل حقیقت پر بھی ہوتی ہے اور جب آنکھ او جھل حقیقتیں محسوس پیکروں کی شکل میں جیتے جاگتے انسانوں کی طرح سامنے آئیں گی تو ان انسانوں کو جغرافیائی حدود کا پابند نہیں کیا جاسکے گا۔ وہ اپنی مخصوص صورت، متعین لباس، اور لفظ و آہنگ کی نمایاں حد بندیوں کے باوجود، پوری عالمی برادری کے ترجمان نظر آئیں گے۔

شاہ صاحب کی شاعرانہ فکر، زمان و مکان کی قیود سے اسی معنی میں آزاد ہے۔

انہوں نے ایک ساعت میں صدیاں سمیٹ لی ہیں۔ چند کرداروں کے چہروں میں دنیا کے ہر انسان کا چہرہ دکھادیا ہے۔ چند کہانیوں کے حوالے دیکر، ہر اس کہانی کا تجزیہ کر دیا ہے جو دنیا کے کسی بھی ملک میں ایک زندہ حقیقت کے طرپر سنی اور سنائی جارہی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے اسی معنی میں انہیں "مجدد" کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ شرع اور فقہ کے اعتبار سے تو یہ اصطلاحِ معروف مجدد نہیں ہیں لیکن ادب کی دنیا میں انہیں یہ مقام ومرتبہ یقیناً حاصل ہے۔

میں نے جب شاہ صاحب کے کلام پر سوچا ہے تو مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ خدا کی طرف کوئی شاہراہ عام نہیں جاتی۔ خدا کی طرف تنگ گلیاں ہی جاتی ہیں۔ اس کا ہر کردار یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتا ہے کہ

"اے آگ میں اپنے ہڈیاں توڑ کر تیرے ایندھن میں پھینک رہا ہوں تا کہ تو بجھنے نہ پائے۔"

ان کے سب کردار نوک خنجر پر رقصاں دکھائی دیتے ہیں، ہر کوئی اپنی صلیب اٹھائے ہوئے ہے۔ جو قول یا عمل انہیں اپنی تقدیر کی راہ سے ہٹانا چاہتا ہے اس کو وہ گناہ کبیرہ کے مترادف سمجھتے ہیں، جب خدا اُن کی طرف مائل ہوتا ہے تو ان کے سر سنگلاخوں پر پٹکتا ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھینک کر انہیں ایک ابدی سالمیت عطا کر دیتا ہے۔ یہی ان کی آزمائش کی انتہا ہے۔ وہ جہاں تک جاسکتے ہیں اس سے بھی آگے جاتے ہیں۔

شاہ صاحب کے کرداروں کو دیکھ کر پڑھنے والا یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ نیل پنکھ جسے انسان کی روح کہا جاتا ہے اس کا تعاقب کتنا مشکل ہے۔

ان کے کردار ویسے تو سب عوامی ہیں لیکن شاہ نے انہیں ابدی اقدار کا سمبل بنادیا ہے ہیلن ایک عام اغوا شدہ لڑکی سے مختلف نہ ہوتی (جس کے اغوا پہ دو گاؤں بر سر پیکار ہوجاتے ہیں) اگر ہومر کا قلم اسے نہ اپناتا اور کشش حسن کا سمبل نہ بناتا۔ بھٹائی کا ہر کردار ایک مسلسل تلاش میں جذبۂ ایثار کا سمبل ہے جیسے وہ چاند کو دیکھ کر کہہ رہا ہو:

"اے چاند میں تجھے کیسے پاسکتا ہوں؟"

چاند کہتا ہے:

"پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگاؤ، میں تمہیں نیچے چشمے پر ملوں گا"۔

ہر کردار اپنی بہشت میں جانے کے لئے کلہاڑی سے اُس کے بند دروازے توڑ رہا ہے اور اس کے بازو شل دکھائی دیتے ہیں اور ہاتھ لہو لہان لگتے ہیں۔ اس مسلسل جانکاہی، مسلسل جستجو کے عالم پر کہیں بھی مایوسی کا پر تو نہیں پڑتا۔ جیسے ان کا ہر کردار قعر اذیت میں ڈوب کر کہتا ہو کہ اس دھرتی پر جب تک پھول ہیں، بچے ہیں اور پرندے ہیں خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ شاہ صاحب میں یہ رجائیت بدرجۂ اتم ملتی ہے اور اس رجائیت کے اظہار کیلئے ان کے پاس ایک رچی ہوئی زبان ہے جس سے ازمنہ قدیم کے الفاظ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کے ہر لفظ کی ایک روح ہے جو صدیوں کے مسلسل ارتقاء سے گذری ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ عوامی زبان کا کوئی لفظ ثقیل نہیں ہوتا۔ بظاہر مردہ لفظ پر دم عیسیٰ پھونکنا بہت مشکل کام ہے لیکن اس کے بغیر شاعری پیغمبری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب نے دیہاتی زبان کے ہر لفظ کو پر و بال جبرئیل عطا کئے ہیں۔ انہوں نے اس زبان کو سحر انگیز ترنم بھی عطا کیا ہے، ایسا ترنم جو کسی گلوکار یا سازندے کے فنی احسان کا محتاج نہیں ہے۔ رنگ و بو کا ترنم سے ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ رنگ و بو سے ترنم کا احساس پیدا ہے۔ یہ ناممکن نہیں کہ لالۂ صحرا سے صدائے جرس سنائی دے اور ایک سندھی وائی سے ٹھٹہ کے موتیے کی بوباس آئے۔ میرے خیال میں بھٹائی کے الفاظ سے کبھی کبھار سفید شگفتگی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھار ان کے ابیات میں ایک کیفیت جلال چونکا دیتی ہے جیسے اس کی لے کہتی ہو کہ:

"ہاں مجھ میں اپنا سانس پھونک دو، اپنا سانس پھونک دو جس طرح ایک شیر اپنے نوزائیدہ بچے کے منہ میں سانس پھونکتا ہے۔"

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے شاہ بھٹائی بہ عرفِ عام ایک فلسفی نہ تھے، وہ

ایک صوفی تھے اور تصوف کی جڑیں فلسفے میں ہیں لیکن ان کا تصوف اس دھرتی سے نشو و نما حاصل کرتا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی وہ سایۂ طوبیٰ سے اٹھ کر بہشت کے دریچے سے جھانکتے ہوں گے: "کاش، ہم ریگزار سندھ پر ایک لہلہاتا ہوا سبز پتہ دیکھ سکیں۔"

وحدہ لاشریک لہ، جب یہ مانیں یار
احمد ﷺ ہیں تخلیق کا باعث، ہو دل سے اقرار
پہنچے نیا پار، بچ کر مشکل گھاٹ سے
(شاہؒ)

پروفیسر محمد معین الدین دروائی

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ قدس سرہ پر وقتاً فوقتاً بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور مختلف اہل قلم نے مختلف زاویۂ نگاہ سے ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش فرمائی ہے۔ کسی نے ان کو اُمیّ کا لقب دیا تو کسی نے بحر العلوم کا، کسی نے ان کو شیعہ (۱) لکھا، کسی نے سنی (۲) اور بعض نے ان کے مسلک کو ناقابل فہم (۳) بھی بتایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک درویش صفت بزرگ اور فنافی اللہ صوفی تھے۔ ان کی آنکھیں صفحہ قرطاس سے زیادہ لوح و کرسی کے کتبات کو پڑھنے والی تھیں۔ وہ شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، حنبلی، شافعی وغیرہ کی جھنجھٹوں سے بہت بلند ہو چکی تھیں۔ وہ 'کوزہ' سے زیادہ 'کوزہ گر' کی محبت میں سرشار تھے۔ اور پھر اس کے نتیجے میں کوزہ گر کی ہر تخلیق پر فدا پر دان تھے۔ ان کا مسلک بھٹکوں کو راہ دکھانا اور ہر انسان تک مالک حقیقی کا پیغام پہنچانا تھا۔ اور اس کے لئے انہوں نے شاعری کو ذریعہ بنایا، کیونکہ نثر کی بہ نسبت نظم کی صنف زیادہ دل پذیر ہوتی ہے۔ نظم میں شاعر کے دل کی دھڑکنیں اور خونِ تمنا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور پھر جو کچھ کہتا ہے سننے والوں کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے:

کیسے پتے کی بات یہ دیوانہ کہہ گیا

یہی وجہ ہے کہ صوفیا نے پیغام رسانی کے لئے نثر سے زیادہ نظم کو پسند کیا ہے اور نظم بھی انہوں نے مقامی زبانوں میں کہی جس سے عوام بہرہ مند ہو سکیں۔ سندھ میں اس وقت فارسی، ہندی و سرائیکی اور سندھی بولنے والے افراد موجود تھے۔ حضرت بھٹائیؒ نے "ہم زبانی سے ہم خیالی پیدا ہوتی ہے" کے اصول پر ان سب ہی زبانوں کو پیغامِ الٰہی پہنچانے کا ذریعہ بنایا اور اسی لئے انکا کلام سندھی سرائیکی اور ہندی (اردو) سب ہی میں موجود ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تذکرہ بہت سی کتابوں میں کیا گیا ہے جن میں سے چند سے مستفید ہو کر یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

---

(۱) ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سارلے (۲) منشی محمد بخش واصف اور ڈاکٹر گربخشانی
(۳) مرزا قلیچ بیگ

آپ کی پیدائش ۱۱۰۱ھ / ۱۶۸۹ء میں ضلع حیدر آباد سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ ہالا حویلی میں ہوئی تھی۔ ہرات کے ایک ذی عزت سادات خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید میر علی، امیر تیمور کے معتمد درباریوں میں سے تھے۔ امیر تیمور نے سید میر علی کی خاندانی وجاہت اور کارگزاری کی بنا پر ان کے چھ لڑکوں کو مختلف ملکوں کا گورنر مقرر کر دیا تھا، جن میں ایک صاحبزادے میر عبدالرزاق بکھر (سندھ) کے اور دوسرے میر ابوبکر سیوہن کے گورنر تھے۔ آپ کے تیسرے صاحبزادے سید حیدر شاہ اپنے والد کے ساتھ ہرات ہی میں قیام پذیر رہے۔ ایک مرتبہ اپنے دونوں بھائیوں سے ملنے سید حیدر شاہ سندھ پہنچے تو وہاں ان کی ذاتی وجاہت اور خاندانی وقار سے متاثر ہو کر ہالا کے ایک معزز سردار شاہ محمد ولد دریاخان ہالہ نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیا۔ سید حیدر شاہ کی پہلی بیوی ہرات میں موجود تھیں۔ پانچ چھ ماہ بعد اپنے والد کی وفات کی خبر پاکر سید حیدر شاہ اپنی دسری بیوی فاطمہ عرف بی بی سلطانہ کو سندھ میں چھوڑ کر ہرات چلے گئے۔ اور وہاں جانے کی کچھ ہی عرصہ بعد ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے۔

ہالا (سندھ) میں بی بی سلطانہ کے بطن سے میر علی پیدا ہوئے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں پہلی سے شرف الدین اور دوسری سے سید احمد نامی دو فرزند ہوئے ان دونوں صاحبزادوں کے خاندان مٹیاری شہر میں شرف پوتہ اور میرن پوتہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اس خاندان میں سید شاہ عبدلکریم بلڑی والے مشہور بزرگ گزرے ہیں جن کی چوتھی پشت میں قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین سرتاج الشعرا سید شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب تاج محمد آغا صاحب نے اپنی تصنیف عکس لطیف میں اس طرح درج کیا ہے:

"(۱) شاہ عبداللطیف، (۲) بن سید حبیب شاہ، (۳) بن سید عبدالقدوس، (۴) بن سید جمال شاہ، (۵) بن سید عبدلکریم شاہ، (۶) بن سید گل محمد شاہ، (۷) بن سید ضیاء اللہ شاہ، (۸) بن سید عبدالمومن شاہ، (۹) بن سید سائیں شاہ، (۱۰) بن سید حاجی شاہ، (۱۱) بن سید جلال محمد، (۱۲) بن سید شرف الدین، (۱۳) بن سید میر علی شاہ، (۱۴) بن سید حیدر شاہ، (۱۵) بن سید

میر علی شاہ ہراتی، (۱۶) بن سید محمد شیرازی، (۱۷) بن سید محمد ترمذی، (۱۸) بن سید علی شاہ، (۱۹) بن سید یوسف شاہ، (۲۰) بن سید حسین شاہ رضا شیرازی، (۲۱) بن سید ابراہیم، (۲۲) بن سید علی حواری، (۲۳) بن سید حسین الاکبری شیرازی، (۲۴) بن سید جعفر شاہ، (۲۵) بن سید امام موسیٰ کاظم، (۲۶) بن امام جعفر صادق، (۲۷) بن امام محمد باقر، (۲۸) بن امام زین العابدین، (۲۹) بن سید الشہداء امام حسین، (۳۰) بن امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہم السلام۔

جیسا کہ سلسلۂ نسب سے ظاہر ہے حضرت سید شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے والد ماجد کا نام سید حبیب شاہ تھا۔ آپ کی والدہ ایک مشہور ولی اللہ حضرت دیانی عرف مخدوم عربی دیانہ کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی ولادت کے بعد آپ کے والد ماجد ہالہ حویلی سے منتقل ہو کر کوٹری میں جا بسے تھے جو موجودہ کوٹری کے بر خلاف بھٹ شاہ سے دو کوس کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، اب ویران ہو چکا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم آخوند نور محمد بھٹی سے حاصل کی، پھر باقاعدہ ان کی تعلیم کے سلسلے کا پتا نہیں چلتا۔ اور یہی امر ان کے بعض سوانح نگاروں کے درمیاں غلط فہمی کا باعث بنا۔ لیکن ان ہی سوانح نگاروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحب کو مثنوی مولانا رومؒ سے بڑی محبت تھی اور وہ اسے کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے ہر دم پڑھتے اور فیضان حاصل کرتے تھے۔ آپ کے کلام میں نہ صرف مثنوی مولانا روم کے بہت نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں بلکہ اکثر موقع پر آپ نے مولانا روم کو اپنا معلم روحانی بھی ظاہر کیا ہے۔ اس وقت کے سندھ کے حکمران میاں نور محمد کلھوڑا نے جو آپ کے عقیدت مند تھے، مثنوی مولانا روم سے حضرت کی شیفتگی کو دیکھ کر اس کا ایک نادر نسخہ تحفتاً پیش کیا تھا۔

محمد بخش صاحب واصفؔ نے شرح لطیفی، میں بڑی تفصیل سے آپ کی فارسی عربی زبان پر لیاقت کو ثابت کیا ہے، مصنف "عکس لطیف" نے ان کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے۔

"شاہ صاحب مطلق ان پڑھ نہ تھے بلکہ آپ کو بہت سے علوم پر کافی عبور حاصل تھا، اور بہت سے زبانیں جانتے تھے، مثلاً عربی فارسی، سرائیکی، ملتانی، ہندی (اردو) پنجابی، بلوچی وغیرہ اور سندھی تو آپ کی مادری زبان تھی۔ اسی کے علاوہ قرآن مجید کی کئی آیات اور عربی فارسی کے فقرے آپ کے کلام میں جابجا موجود ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کو علوم ظاہری پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔"(۵)

حضرت شاہ عبد لطیف بھٹائیؒ کی صورت و سیرت کے بارے میں تقریباً ان کے تمام سوانح نگاروں نے تفصیل سے بحث کی ہے، تاج محمد آغا نے لکھا ہے:

'وہ ایک شکیل و جمیل انسان تھے، سینہ کشادہ اور بازو سڈول اور مظبوط رکھتے تھے، قوت اور ہمت کی حد نہ تھی، ریش مبارک چوکور اور بھری ہوئی، گندمی رنگ، سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں، جو شرابِ عشق کے نشے میں ہر وقت مخمور رہتی تھیں، خلق خدا پر نہیات خلیق اور شفیق تھے، کبھی کسی کو اپنی طرف سے تکلیف نہیں پنہچائی۔ آپ سادگی پسند تھے، اکثر گیروے رنگ کی کفنی پہنتے تھے جو کاتے ہوئے سوت سے بنی ہوتی تھی، سر پر صوفیانہ وضع کی ایک سفید اور دراز ٹوپی پہنتے تھے جسے تاج یا کلاہ کہتے ہیں، اس تاج کے اوپر ایک چھوٹا سا کالا کپڑا عمامہ کی طرح لپٹا ہوا رہتا تھا۔ ہاتھ میں ایک گول دستہ کی عصا رہتی تھی۔"(۶)

---

(۵)"عکس لطیف" از تاج محمد آغا

(۶)"عکسِ لطیف" از تاج محمد آغا مطبوعہ 1951ء ص ۴۱-۴۲

شاہ صاحب کو کوزہ گر سے عشق اس کے ایک کوزہ کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے ان کی شاعری کی بھی ابتدا ہوئی۔ عشق کی آگ دل میں لئے وہ شہر شہر، قصبہ قصبہ، کوبہ کو اور دربہ در کی خاک چھانتے پھرے، راستے میں سنیاسی فقیروں کی صحبت اختیار کی، دوران سفر جہاں جہاں جاتے وہاں کی مقامی عشقیہ داستانوں سے اپنی شاعری کے لئے مواد لیتے او ان کو قلمبند کر لیتے۔ کراچی اور حیدر آباد کے درمیان جھیل کنجھر پر پہنچے تو وہاں کے "نوری اور جام تماچی" کی عشقیہ داستان کو اپنی "سر کاموڈ" میں قلمبند کر کے غیر فانی بنادیا۔ وہاں سے ٹھٹہ پہنچے اور بزرگان عظام اور صوفیائے کرام کی صحبت سے مشرف ہوئے، وہاں سے روانہ ہونے کے وقت "سہنی مہنیوال" کی مشہور داستان عشق کو اپنی شاعری میں قلمبند کر لیا۔ ٹھٹہ کے بعد بھنبور پہنچے تو وہاں "سسی پنوں" کی داستان سے متاثر ہو کر اس کو بھی اپنی شاعری کے لیے منتخب کر لیا، اور اپنے سوزوساز سے اس کو غیر فانی بنا دیا۔ طویل صحرانوردی کے بعد عمر کوٹ پہنچے تو وہاں کی "عمر اور مارئی" کی مشہور داستان کو اپنی شاعری کی لئے منتخب کر لیا اور اس داستان کے ضمن میں " كُلّ شَيْءٍ يَرجع اِلٰى اصلِهٖ "اور حب الوطنی کے بڑے بڑے رموز و نکات بیان فرمائے عمر کوٹ سے سو امیل کے فاصلے پر مہارانی مومل کا محل دیکھا تو اس سے "مومل اور رانا" کی داستان کا مواد اپنی شاعری کے لئے اخذ کر لیا۔ اور ان تمام داستانوں کو اپنی شاعری میں اس طرح سمودیا کہ آگے چل کر وہ تصوف کے اشارے بن گئے۔

شاہ صاحب کے سندھی کلام کا مجموعہ "شاہ جو رسالو" یعنی (شاہ کا رسالہ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اس میں تصوف اور اخلاق کے بے شمار رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ سندھی شاعری کے اس غیر فانی شاہکار کا کمال یہ ہے کہ جوں جوں قدامت کی چادر اس پر پڑتی جاتی ہے۔ اس کا حسن اور نکھرتا جاتا ہے اور سندھی زبان اپنی منزلوں سے گزر کر جیسے جیسے نئے سانچے اختیار کر رہی ہے "شاہ جو رسالو" کی زبان کو اپنا ہم سفر پاتی ہے۔ اس کے بعض سندھی اشعار ہندی اردو سے بہت زیادہ ملتے جلتے

نظر آتے ہیں۔ مثلاً

سوری ءَ چڑھن سیج پسن ای ءَ کام عاشقن

سولی چڑھنا خوشی محسوس کرنا یہ کام عاشقوں کا

شاہ صاحب کے کلام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایرانی شاعری کی اندھی تقلید سے بلکل پاک ہے۔ ان کے یہاں خطِ رخسار، وبند قبا، اور کاکل وکلاہ، کی پابندی نہیں ملتی۔ انہوں نے سر زمین حسن و عشق کے لئے ایران کے فرہادو شیریں، نجد کے قیس و لیلیٰ، مصر کے یوسف وزلیخا، اور عراق کے وامق وعذرا کو نہیں منتخب کیا، بلکہ سندھ کے مومل اور رانو، عمر اور مارئی، نوری اور تماچی، اور سسی اور پنوں کو پسند کیا۔ ان کی نظر میں نیل و دجلہ اور نرات سے زیادہ دلکش مہران اور کاک کی موجیں ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری سے اخلاق تصوف کی بڑی بڑی تعلیمات دیں۔ وہ خیالات کی فضا میں کبھی نہیں اڑتے ان کو ہمیشہ نقیقت کی تلاش رہتی ہے اور جس وقت کوئی حقیقت ان کے سامنے آجاتی ہے اس کو اسی لمرح دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور اس طرح وہ زندگی کے چہرے سے حقیقت کا قاب اٹھانے میں بہت زیادہ حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے "عش و سپردگی" پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور غالباً یہ مولانا روم کا غیر معمولی اثر ہے۔ وہ عشق ہی کو سب مرض کی دوا قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ خرد سے گتھیاں سلجھتی نہیں الجھتی ہیں مثلاً:

سوری متھے سین کہڑے لیکھے سرا

جیلہ لگانین تے سوربیائی سیج تھی

(معنی) وہ کون ہے جو اپنے دوستوں کو سولی پر دیکھ کر خوش ہوا، جب آنکھیں چار ہوئیں تو سولی بھی سیج بن گئی۔

وحدت الوجود کی وضاحت آپ کے کلام میں اکثر جگہ ملتی مثلاً:

اک قصر در لکھ، کوزیں کنس کڑکھیوں

جیڈاہ کریاں پر کھ تیڈاہ صاحب سامھوں

(معنی) ایک محفل لاکھ دروازے، اور اس میں کروڑوں کھڑکیاں جدھر دیکھتا ہوں ادھر صاحب ہی سامنے ہے۔

وحدتاں کثرت تھی کثرت وحدت کل
حق حقیقی ہیکڑو بولی ئی مَ بھل
ھو ھلاچو ھل با اللہ سندو سجنیں

(معنی) وحدت میں کثرت بنی اور سب کثرت وحدت ہو گئی وہ حق ہے اور در حقیقت ایک ہے تو اسے بھول کر غیر کو مت پکار۔ خدا کی قسم ہر جگہ اسی دوست کا شور ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب رسول اللہؐ اور اہلِ بیتؓ کی محبت کو زندگی کا سب سے بہترین سرمایہ سمجھتے تھے اور ہمہ دم اس میں سرشار رہتے تھے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی قدس اللہ سرہ کے اکثر اشعار اردو میں بھی ملتے ہیں، لیکن ابتدائی بارہویں صدی ہجری میں سندھ کے اندر اردو اشعار "سندھی ریختہ" ہی کی شکل میں مل سکتے ہیں اور وہ ان کے "شاہ جو رسالو" میں تلاش کرنے سے کافی مل جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان کے دو اشعار جو بہت صاف اردو میں کہے گئے ہیں نمونۃً درج ذیل کرتے ہیں:

(۸) بلبل روئے رین دن کہاں بھئی گلزار
ان کی قیامت آج ہے جن کے بچھڑے یار
(۹) لاالہ کر آرسی الااللہ سے دیکھ
محمد صورت رب کی اس میں مین نہ میکھ

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا وصال تریسٹھ برس کی عمر میں ۱۴ صفر ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۶ء کو ہوا۔ آپ کے ایک مرید محمد پناہ رجا نے یہ تاریخ وفات لکھی۔

گفت ایں رجا مرید ش ارتحال پیر
گرویدہ محو عشق و جودِ لطیف میر

---

(۸) سندھ کے جدید اردو شعراء از مشتاق علی جعفری ص۔۱۸ اس خیال کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے ع تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی۔ (۹) عکسِ لطیف ص۔۳۸

شاہ بھٹائی سے میاں غلام شاہ کلہوڑا حکمران سندھ کو بڑی ارادت اور عقیدت تھی۔ آپ کا مقبرہ ان ہی نے بڑے اہتمام سے ۱۱۶۷ھ میں تعمیر کرایا اور اظہارِ عقیدت کے لئے مقبرہ کا مینار اتنا اونچا بنوایا کہ خدا آباد سے نظر آئے۔ یہ مقبرہ سندھ کے مشہور معمار عیدن کے زیر نگرانی تعمیر ہوا تھا۔ غلام شاہ کلہوڑا کے بعد میر نصیر خان تالپور نے مقبرہ اور مسجد کی نئے سرے سے مرمت کروائی اور اس کے گرد قلعہ کی تعمیر میں ہاتھ لگایا لیکن مکمل نہ ہو سکا۔ میر نور محمد خان تالپور نے مقبرہ کے ایوان میں ایک کنواں بنوایا اور ان کے چچازاد بھائی نے روضہ مبارک کے سامنے چاندی کا ایک دروازہ بنوایا جو آج تک قائم ہے۔

پریت میں جن کا من ہے جیسے، کوئی چھلکتا جام
پریت کے جام پہ جام چڑھائیں، پھر بھی تشنہ کام
منزلِ عشق سراب ہے سکھیو! پیاس یہاں ہر گام
پیاس ہی پیاس مدام، جو ہیں بحرِ عشق میں
(شاہؒ)

مرزاعابد عباس

شاہ لطیفؒ اور مذہب

معاشرے میں انتشار کو کم کرنے اور اسے مستحکم بنانے میں مذہب ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مذہب کو اسکے صحیح معنی اور مفہوم کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ مذہب کو اس کے عروج کے زمانے میں بھی مفادات کے لئے استعمال کیا گیا اور زوال کے زمانے میں بھی اور دراصل مذہب کے زوال کا سبب بھی یہی ہے۔

شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا۔

سندھ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ایک بار جب اسلام یہاں آگیا تو اس کا اثر کبھی کم نہیں ہوا یہاں کی تاریخ اور ماحول پر ہمیشہ اُس کی چھاپ رہی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں صوفیائے کرام نے اپنی تعلیم اور تبلیغ سے اسلام کے پیغام کو باقی رکھا اور جب کبھی اسے خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے قربانیوں سے بھی گریز نہیں کیا۔

شاہ لطیف کے زمانے میں مغل اقتدار کے زوال کے ساتھ معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔ شاہ لطیف صوفیاء کے خاندان سے تھے۔ پاکی اور پاکیزگی اُن کی روایت تھی۔ مذہب اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اوائلِ عمری میں سیر وسیاحت، لوگوں میں گھومنے پھرنے، حالات کا مشاہدہ کرنے سے جہاں اُن کی نظر براہ راست حالات پر پڑی وہیں ان کی وسعتِ نظر میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے غربت کو بڑے قریب سے دیکھا اور منتشر معاشرے میں غربت سے پیدا ہونے والے مسائل کا اندازہ کیا۔ ایسے ماحول میں انسان اور خدا کا رشتہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور اس رشتے کو جوڑنے سے ہی انتشار پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

مذہب کا سب سے بنیادی تصور توحید ہے۔ اس کا پوری طرح سمجھنا مشکل ہی

نہیں بلکہ ناممکنات میں سے ہے۔ بقول شاعر :

عقل میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا۔

مگر یہ مذہب کی ابتدا ہے۔ اِس پر یقین کرنا اور اسے اپنے جذبوں کا مرکز بنانا ضروری ہے ورنہ بات آگے نہیں بڑھتی۔

دوسرا بنیادی تصور نبوت ہے۔ نبی خدا کا پیغام بندوں تک پہنچاتا ہے جو بندوں اور خدا کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ خدا کا پیغام ایک نظامِ زندگی پیش کرتا ہے، ایک راستہ بتاتا ہے جس پر چل کر انسان اپنا مقصدِ حیات حاصل کرتا ہے۔ اس نظام کو اپنانے سے امن اور سکون کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ معاشرہ مستحکم ہوتا ہے اور ترقی کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ خوف اور حزن سے نجات ملتی ہے۔ نبی اس راستے کی مشکلات سے بھی آگاہ کرتا ہے، نتائج سے خبردار کرتا ہے۔ ترغیبات کا شکار ہونے کے خطروں کی نشاندہی کرتا ہے اور نظام کے قیام اور بقا کیلئے ہر قربانی دینے کی لئے تیار کرتا ہے۔

تیسرا بنیادی تصور یوم آخرت کا ہے۔ یہ احتساب کا دن ہے۔ اس دن ذرہ برابر کی ہوئی نیکی اور بدی سامنے لائی جائے گی۔

اس نظام کو اپنانے اور چلانے کے لئے بنیادی ڈسپلن کی ضرورت ہے جسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اس ڈسپلن کی تین شرائط ہیں۔ اول نظام کو دل سے تسلیم کرنا یعنی ایمان، دوسرے اس پر عمل کرنا یعنی شریعت اور تیسرے اس راستے میں آنے والے خطرات سے ہمہ وقت چوکنا اور خبردار رہنا۔

شاہ لطیفؒ نے اپنے زمانے کے انتشار کو روکنے اور عوام کو متحد رکھنے کیلئے اپنی شاعری میں جو استعارہ استعمال کیا ہے وہ مذہب کا ہے۔ یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ ان کا یہ عمل شعوری تھا یا اپنے جذبوں میں ڈوب کر انہوں نے لاشعوری طور پر ایسا کیا۔ بہر حال نتیجہ اس کا یہی نکلا کہ لوگ ان کے گرد اکھٹے ہو گئے اور اُن کے پیام کو قبول کیا۔ لیکن کئی باتوں سے پتہ

چلتا ہے کہ انکی یہ کوشش شعوری تھی۔ پہلی تو یہ کہ انہوں نے اپنا کلام لکھا نہیں بلکہ جذب کے عالم میں یہ انکی زبان سے ادا ہوتا رہا اور اُن کے گرد بیٹھے لوگوں نے اسے لکھ لیا۔ دوسرے یہ کہ جابجا اُن کے کلام میں "ادیوں شاہ لطیف چوے" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابیات کہنے کی بجائے یہ خطاب کر رہے ہیں۔ تیسرے یہ کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ لوگوں نے اُن کا کلام لکھ کر جمع کر لیا ہے تو انہیں محسوس ہوا کہ توجہ الفاظ پر ہے پیغام پر نہیں اور انہوں نے یہ جمع شدہ کلام کراڑ جھیل میں پھینک دیا۔ اور چوتھے یہ کہ ان کا کلام شاعری کی روایتی بند شوں سے پاک ہے۔ بہر حال اگر یہ غیر شعوری کوشش بھی مانی جائے تو ان کا یہ کلام شاعری اور نتائج دونوں اعتبار سے عظیم ہے اور ایک انگریزی محاورے کے مطابق کہ پڈنگ کا مزا کھانے میں ہے۔ عوام پر اپنے اثر زبان، ڈکشن اور مقبولیت کے اعتبار سے آج تک قابلِ تقلید ہے۔ اپنے موضوع سے تھوڑا سا گریز کرتے ہوئے ایک تجویز پیش کرنے کی جرات کر رہا ہوں کہ شاہ لطیف کا مطالعہ کرنے والے کسی طالب علم کو اُن اثرات کا جائزہ لینا چاہیئے جو شاہ لطیف کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے آج بھی سندھ کی ثقافت میں نمایاں ہیں۔ میرے خیال میں عمرانیات یا ادب میں Ph.D کیلئے یہ ایک اچھا مقالہ ہوگا۔

کسی فکر کو پیش کرنے کیلئے زبان اور اسے قابلِ قبول بنانے کے لئے اندازِ بیان کا صحیح انتخاب بہت ضروری ہے۔ شاہ لطیفؒ ان دونوں مرحلوں سے بخوبی گذر گئے۔ اس زمانے میں علمی موضوعات کے اظہار کے لئے فارسی زبان کا رواج تھا جو کسی بھی فکر کو عوام تک نہیں پہونچا سکتی تھی اور شاہ لطیف کے مخاطب عوام ہی تھے۔ اب یہ بات سندھی زبان کے عالم ہی بتا سکتے ہیں کہ علمی موضوعات کو برتنے کی سندھی زبان میں اس وقت اتنی اہلیت پیدا ہو چکی تھی کہ نہیں۔ مگر شاہ لطیف نے اتنی خوبی سے مشکل ترین موضوعات کا اظہار کیا ہے کہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ یہاں پر بھی ایک جملۂ معترضہ کہنے کی اجازت دیجئے۔ آجکل ہمارے کئی دوست جو انگریزی زبان کے دلدادہ ہیں بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہماری زبانوں میں آج کی سائنسی دنیا اور اسکی ترقیوں کی تعلیم اسلیئے نہیں دی جا سکتی کہ ان

زبانوں میں ان موضوعات کے اظہار کی اہلیت نہیں۔ اہلیت زبان میں نہیں خود میں تلاش کرو ۔ ہماری زبانیں تو اہل ہیں ہم خود اہل نہیں۔ بہر حال شاہ لطیف نے ان مشکل موضوعات کو سمجھنے اور قابلِ قبول بنانے کے لیے شعر کے قالب میں ڈھالا جسے آسانی سے نہ صرف یہ کہ پڑھا جاسکے بلکہ گایا بھی جاسکے۔ جو غریب محنت کش کسان ان کے مخاطب تھے اُن میں چند ہی پڑھے لکھے رہے ہونگے اسلئے ان کے پڑھنے اور سمجھنے کا سوال نہیں تھا۔ وہ تو سن کر اور گا کر ہی ان موضوعات کو اپنے اندر جذب کر سکتے تھے۔

مذہب بظاہر ایک خشک موضوع ہے اور خصوصیت سے اسکا بنیادی تصور توحید تو بت ہی مشکل ہے۔ فارسی زبان میں ایک قطعہ ہے :

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و دیدہ ایم
عالم تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ماہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

خیال و قیاس و گمان و وہم سے پرے کسی ہیولے کو پیش کرنا اور اسے دیکھے اور سمجھے بغیر ماننے کی تلقین کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ شاہ نے اسے اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ اسکو سننے اور مسلسل اسکا ورد کرنے سے یہ تصور جذب کی منزل تک پہونچ گیا۔ رسالو کی ابتدا سر کلیان سے ہوتی ہے اور سر کلیان کی ابتدا اسی تصور سے ہے۔ پیش خدمت ہے :

اول خدا علیم اعلیٰ عالم کا ولی
قادر اپنی قدرت سے قائم خود ہے قدیم
مالک مولی لاشریک رب رحمان رحیم
کر کے کرم کریم نے پیدا کیا جہاں کو۔
(ترجمہ الیاس عشقی)

تیری ہی ذات اول و آخر

تو ہی قائم ہے اور تو ہی قدیم

تجھ سے وابستہ ہر تمنا ہے

تیرا ہی آسرا ہے رب کریم

کم ہے جتنی کریں تیری توصیف

تو ہی اعلیٰ ہے اور تو ہی علیم

والی شش جہات تیری ذات

رازقِ کائنات ربِ رحیم

اسی سر میں توحید کے تصور کو واضح کرتے ہوئی آواز کی گونج کا استعارہ کرتے ہیں کہ آواز تو ایک ہے۔ یہ ہماری سماعت کے سبب سے دو معلوم ہوتی ہے ایک اور استعارے میں ایک محل کا ذکر کرتے ہیں جسکے کئی دروازے اور کھڑکیاں ہیں لیکن جہاں سے دیکھو مالک ہی نظر آتا ہے۔

خدا کا یہ تصور خالصتاً اسلامی ہے۔ خدا ہی ہے جو سب کچھ جاننے والا ہے تمام دنیا کا مالک ہے، سب کا رازق ہے، کریم ہے اور دنیا کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس تصور کو بحث کے ذریعے دوسروں تک پہونچانا آسان نہیں لیکن جب نغمے کی صورت میں آتا ہے تو دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور دل میں اتر جانے والے سے محبت بھڑ جاتی ہے۔

توحید کے بعد دوسرا بنیادی تصور نبوت کا ہے۔ سر کلیان ہی میں توحید کے بعد نبوت کا ذکر ہے۔ عقیدے کے ساتھ ساتھ محبت کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے:

پیدا کیا جہاں کو جس لمحے جس آن

مالک محمد ﷺ کو کیا، جس کی اعلیٰ شان

کلمہ دل میں کریم کا ظاہر کرکے زبان

انا لولاک وانت محبوبی، اسکا نام نشان

دونوں ایک سمان، محبت سے سید کہے۔

پیدا کیا انسان کو عالم ہژدہ ہزار
حامی، ہادی، ہاشمی، سرور اور سردار
وہ محبت سرکار کی وہ اصحاب کبار
چیدہ چاروں یار، ملے حرم میں حبیب سے۔

☆

وحدہ لاشریک لہ ہر دم لب پر آئے
سنت، واجب، فرض، کچھ قضا نہ ہونے پائے
توبہ کی تسبیح پڑھ جو دل کا روگ مٹائے
خالی اسکی یاد سے کوئی سانس نہ جائے
دل والو محبوب کو دل میں رکھو بسائے
چاہے دل کو جلائے دوزخ جیسی آگ بھی۔

☆

وحدہ لاشریک لہ جس نے کیا اظہار
اسکو مقام محمدی کی منزل نہیں دشوار
سر کی نذر گذار، جھکا نہ آگے غیر کے۔

☆

وحدہ لاشریک لہ انس و جاں کا کلام
دل سے مقام محمدی فاصلہ یک گام
ساحل بے الزام، دل دریا میں ڈوب گیا۔

☆

وحدہ لاشریک لہ ہے جس کا ایمان
حرف مقام محمدی ان کے قلب و لسان
حق کا ہے فرمان دل کا دریا پار کر

یہاں ذکر عقیدہ نبوت کا ہے لیکن ایک ایک لفظ میں محبت کی لہر اور بہار کی رو دوڑتی نظر آتی ہے جو محمد ﷺ کو نبی کے ساتھ ساتھ ایک محبت کی جانے والی ہستی کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ محبت کے بغیر اطاعت کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ خدا اور رسول کی پہچان محبت کے ذریعے کرانے سے اطاعت کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور مقصد بھی یہی ہے۔ روزِ ازل اپنے خالق سے روحوں کا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" کی جواب میں "بے شک" کہ دینا ایک ایسا عہد ہے جو ابد تک انسان کو خدا کی اطاعت کا پابند کر دیتا ہے۔ اور خود باری تعالی سورہ "ال عمران" میں فرماتا ہے "ان کنتم تحبون اللہ فتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم" (اگر تم کو خدا سے محبت کا دعویٰ ہے تو (رسول) کی اطاعت کرو، اللہ تم کو دوست بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا) گویا اللہ اپنی محبت کی قیمت محمد ﷺ کی اطاعت کو قرار دیتا ہے اور خطاؤں کی معافی کے انعام کا وعدہ کرتا ہے۔ گویا سارا زور محبت اور اطاعت پر ہے۔ کچھ لوگ دین کی تبلیغ میں خدا کی جباری اور قہاری پر زیادہ زور دیتے ہیں جس سے خوف پیدا ہوتا ہے اور اسکی رحمت اور کرم کا ذکر نہیں کرتے جس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ کوئی گناہ سوائے شرک کے ایسا نہیں جسکی معافی کی نوید خدا نے نہ دی ہو اور جگہ جگہ اپنے بندوں سے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے۔ مذہب کو گولی کی طرح بندوق میں بھر کر چلا دینے سے مذہب نہیں پھیلتا۔ کتاب الٰہی خوف اور حزن سے روکتی ہے اور محبت کی طرف بلاتی ہے۔ امن، سلامتی اور محبت کے نغمے سنا کر ہی دین سے محبت اور خدا و رسول ﷺ کی اطاعت کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

شاہ لطیف نے خدا اور رسول کی پہچان محبت ہی کو بنایا ہے اور بقولِ اقبالؒ :

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک

اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ شاہ لطیفؒ کے زمانے کے کچھ علماان کی موسیقی سے دلچسپی کے خلاف تھے۔ ان کا ایک وفد شاہ سے ملنے کیلئے آیا۔ شاہ نے

موسیقی کے تمام سازوں کو برابر کے کمرے میں رکھوا دیا اور علما کو عزت و احترام کے ساتھ بلایا۔ گفتگو میں شاہ نے ایک تمثیل بیان کی کہ ایک درخت جس سے لوگ بے شمار فائدے اٹھاتے ہیں پانی کی کمی کے سبب سے خشک ہو رہا ہے۔ پانی موجود ہے مگر گند ہے۔ اگر اس گندے پانی کو درخت کی جڑوں میں ڈال دیا جائے تو وہ شاداب ہو جائے گا۔ کیا اس میں کوئی اعتراض کی بات ہے۔ علمانے جواب دیا ''نہیں، اس میں کوئی حرج نہیں''۔ شاہ صاحب نے کہا کہ ''میرے دل میں اللہ کی محبت کا درخت پروان چڑھ رہا ہے جو بغیر نغمے کے مرجھا جا رہا ہے۔''

اُسی وقت ساتھ والے کمرے سے سازوں کا آھنگ جاگ اٹھا۔ علما حیران رہ گئے اور شاہ صاحب کو سکون کے عالم میں چھوڑ کر چلے گئے۔

کسی فارسی شاعر کا شعر ہے :

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

(میں کہاں اور نغمہ کہاں۔ یہ سازِ سخن تو ایک بہانا ہے جس کے ذریعہ میں بے نکیل اونٹوں کو قطار میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں)

محبت کے ان نغموں سے شاہ لطیف بکھرے ہوئے لوگوں کو خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت گذاروں کی صف میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ محبت کے اس مرکز پر لوگوں کو جمع کرنا اطاعت کے عمل کو آسان کر دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تصور کے تقاضے عملی دنیا میں پورا کرنا آسان نہیں۔ مذہب نے اسکے لئے بنیاد شرط تقویٰ رکھی ہے۔ قرآن بھی متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ تقویٰ کے سلسلے میں بھی زیادہ زور خوف خدا پر دیا جاتا ہے۔ تقویٰ میں خوف کا عنصر کتنا ہے اسے تو میں نے ناپا نہیں لیکن تقویٰ کے اجزائے ترکیب میں پاکیزگی اور احتیاط ہیں۔ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ اگر کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان میں سے آپ اپنا دامن بچا کر گزر جائیں تو یہ تقویٰ کی مثال ہے۔ میرے خیال میں

تقویٰ اور بھی آگے کی منزل ہے۔ اور وہ ہے ہمیشہ چوکنا رہنا۔ اگر جھاڑیوں میں صرف کانٹے ہی کانٹے ہوں تو وہ نظر آجاتے ہیں اور کوئی بھی بینا آنکھ انہیں دیکھ سکتی ہے اور کوئی بھی ذی ہوش اپنا دامن اُن میں الجھانے کی غلطی نہیں کرے گا لیکن اس دنیا میں کانٹے پھولوں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی کا شعر ہے :

یہ کس نے شاخِ گل لاکر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ ہم نے شوقِ گل بوسی میں کانٹے پر زبان رکھ دی

پاکیزگی کے راستے میں ایسے بے شمار مقامات آتے ہیں جہاں انسان کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا ہے ورنہ دامن آلودہ ہو جاتا ہے۔ اور چوکنا رکھنے کے لئے تین بنیادی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات اپنے عقائد پر مکمل ایمان۔ دوسرے ایک لمحے کیلئے بھی غافل نہ ہونا اور تیسرے ترغیبات سے مکمل گریز۔ ان میں سے جن میں بھی جھول پیدا ہوگا تقویٰ کا دامن داغدار ہو جائے گا۔

شاہ لطیف کا کمال یہ ہے کہ جہاں انھوں نے عقیدے سے وابستگی محبت کی معرفت کرائی ہے وہیں محبت کی کہانیوں کے ذریعے ان تینوں خطرات سے باخبر کیا ہے۔ شاہ لطیفؒ کا ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے کہ شاہ کا خاصا کلام اور پیغام کہانیوں کی معرفت ہی پہنچا ہے۔ تقویٰ کے تصور کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کرنے کے بات تو سمجھ میں آجاتی ہے لیکن اسے دل میں اتارنے کیلئے کچھ اور چاہئے۔ شاہ صاحب نے ان کہانیوں کا سہارا لیا جو معروف بھی تھیں اور مقبول بھی اور محبت بھری بھی۔ شاہ صاحب نے انہیں بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ وہ پوری کہانی بیان نہیں کرتے۔ جب کہانی اس مقام پر پہونچتی ہے جہاں انہیں اپنی بات کہنے کیلئے مؤثر ترین نقطہ ملتا ہے تو وہ کہانی چھوڑ کر اپنا پیغام دے دیتے ہیں۔ بات صرف بات کے ذریعے اتنی مؤثر نہیں ہوتی بلکہ اگر اس کے پیچھے پورا ماحول اور جیتا جاگتا کردار ہو تو دل میں اتر جاتی ہے۔

ہر کہانی کا ایک مقصد ہے اور اسی اعتبار سے اس کے رستے کی لغزش ہے اور اس

لغزش کا شکار ہونے والا اسی اعتبار سے اپنے مقصد سے محروم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس آزمائش سے گزر جانے والا مقصد پالیتا ہے۔ بنیادی طور پر پیغام ایک ہی ہے کہ اگر مقصد سے وابستگی کی راہ میں آزمائشوں سے گزر جانے کا حوصلہ ہے تو مقصد حاصل ہو گا ورنہ نہیں۔

شاہ صاحب کی ان کہانیوں سے جو مطلب اور مفاہیم اخذ کئے گئے ہیں ان سے سب آگاہ ہیں اور مجھے بھی ان سے اتفاق ہے لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے میں ان میں ایک جہت کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کا کلام محبت کے مرکز کے گرد گھومتا ہے۔ انہوں نے جتنی کہانیاں اپنائی ہیں وہ محبت ہی کی کہانیاں ہیں جو ان کے پیغام کو مجسم اور جاندار کرداروں کی شکل میں پیش کر کے اسے طاقتور و قابل قبول بناتی ہے محبت انسان کا بنیادی جذبہ ہے بقول شاعر:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

محبت کا مقصد محبوب کا حصول ہے اسکے لئے جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے۔ لیکن محبوب کو حاصل کر لینے پر ہی بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ محبت اور زیادہ نازک مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ سسی، لیلاں، مومل تینوں اس سخت منزل سے گزرتی ہیں۔ سسی سوگئی تو اسکا محبوب چھن گیا۔ اب اسکی قسمت میں ایک لامتناہی دشت ہے جو آخر کار اسے نگل جاتا ہے۔ اردو کے ایک مشہور صوفی شاعر اصغر گونڈوی کا ایک شعر ہے:

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا۔

لیلاں نے ایک ہار کے بدلے اپنے محبوب کی توجہ کے چند لمحات کا سودا کر لیا۔ یہ سودا اسکی زندگی کا سودا بن گیا۔ مومل نے اپنی محبت میں ایک جھوٹی تسلی کو شریک کر لیا اور محبوب کے بدلے ایک چھڑی اسکا مقدر بن گئی جو سزا کی علامت ہے۔ یہ تینوں وہ تھیں جن کو ان کا محبوب مل گیا تھا مگر اپنی نادانی سے انہوں نے کھودیا۔ 'الست بربکم' کے جواب میں

"بلیٰ" کہنے کے بعد نہ لمحے بھر کی غفلت کی گنجائش ہے نہ محبت میں کسی قسم کی شرکت کی "بلیٰ" کہنے کے بعد تو اپنی ذات کی نفی ہو جاتی ہے۔ نہ وہ غافل ہو سکتی ہے، نہ کوئی ترغیب اسے اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے اور نہ ہی وہ خود کو جھوٹی تسلی دے کر شرک کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ان الشرک لظلم عظیم۔ اس جرم کو خدا بھی معاف نہیں کرتا۔ انسانوں کی محبت "نہ میں دیکھوں اور نہ تو بے دیکھن دوں" کا اصول کار فرما ہے تو انسان اور خدا کی محبت میں یہ کیسے ممکن ہے۔ لیلاں نے اپنے محبوب کو دیکھنے دیا اور مومل نے جھوٹا اور بے ضرر ہی سہی دوسرا محبوب بنالیا۔

ان جاندار مثالوں سے بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے کہ محبوب کو حاصل کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ اسے قائم کرنے کیلئے بھی ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کہانیوں کے مقابلے میں ماروی اور رائے ڈیاچ کی کہانیاں ہیں۔ ماروی تمام ترغیبات کے باوجود اپنے محبوب سے اپنا رشتہ توڑنا گوارا نہیں کرتی۔ اسے کیا کچھ حاصل نہیں تھا۔ سونا، چاندی قیمتی ملبوسات آرام دہ بستر، محل وغیرہ مگر اسنے سب کچھ ٹھکرادیا۔ نہ بستر پر سوئی نہ کپڑے بدلے نہ سر میں تیل ڈالا نہ کنگھی کی، اپنے محبوب کی لگن میں اس نے عمر جیسے مقتدر حکمران کو سر ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ محبت کی یہ لگن ہی انسان کو سُرخرو، آبرومند اور سربلند کر دیتی ہے اور آج ماروی لاکھوں دلوں پر راج کر رہی ہے۔

اپنے مقصد کے حصول کے لئے انسان کو قربانیوں کی شاہراہ سے گزرنا پڑتا ہے اور اس میں سب سے بڑی قربانی اپنی جان کی قربانی ہے۔ رائے ڈیاچ نے شعوری طور پر اور سوہنی نے فریب کا شکار ہو کر یہ قربانیاں دیں اور ابدیت حاصل کر لی۔

یہی تقویٰ کا مفہوم ہے۔ ایک مذہبی فلسفی اسے خطبوں کے ذریعہ دوسروں تک پہونچانے کی کوشش کرتا ہے اور اچھے یا برے طریقوں سے اسے سمجھنے اور برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے نہایت جاندار کرداروں سے اسی مفہوم کو دل میں اتار دیا ہے۔

اس تمام گفتگو سے یہ تاثر بھی قائم ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب ایک عام مولوی تھے

جو مذہب کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ یہ تاثر وہ لوگ قائم کر سکتے ہیں جو مذہب کو ایک عام بلکہ عامیانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور جو مذہب کو عقائد کے حصار میں قید کئے ہوئے ہیں۔ مذہب ایک دائرہ ضرور ہے، مگر حصار نہیں۔ دائرے کھینچ دیئے جائیں تو لا محدودیت (Infinity) پیدا ہو جاتی ہے جو اللہ کی صفت ہے۔ لیکن اگر مرکز تبدیل کر کے دائرے کھینچے جائیں تو وہ ایک دوسرے کو کاٹنے لگتے ہیں۔ شاہ لطیف کے زمانے میں جب مغل اقتدار پر زوال آیا تو سماجی اور اخلاقی قدروں کا بھی زوال شروع ہو گیا۔ روشن خیالی اور بنیاد پرستی میں ٹکراؤ ہونے لگا اور مذہب نے اپنے گرد حصار کو تنگ سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اقتدار اور مذہب میں عام طور سے بیر ہوتا ہے چونکہ اقتدار اپنے میں شرکت کو گوارا نہیں کرتا اور مذہب سرپرستی سے بالاتر ہے۔ مسلمانوں کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ انہیں اقتدار مذہب ہی کی معرفت حاصل ہوا لہٰذا وہ اس سے تو دامن بچا نہیں سکتے تھے مگر اسکی بالادستی ان کے اقتدار کے تقاضوں سے ٹکراتی تھی اسلئے انہوں نے مذہب کو اپنے دربار میں قید کر لیا۔ صوفیا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کو دربار کی قید سے آزاد کرا لیا۔ اس کے لئے انہوں نے بڑی سختیاں جھیلیں لیکن سر نہیں جھکایا۔ لیکن بعد میں یہ ہوا کہ دربار سے نکل کر عوام میں آنے کے بعد مذہب پھر خانقاہ میں قید ہو گیا۔ دربار میں وہ حکمرانوں کے چنگل میں تھا اور خانقاہوں میں اوہام کے چنگل میں آ گیا۔ اس کے بین بین دو صورتیں اور نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاکباز صوفیوں نے اپنا تعلق نہ دربار سے رکھا نہ خانقاہ سے۔ انہوں نے خود کو مذہب کے ذریعہ پاک زندگی کا نمونہ بنایا اور امر ہو گئے۔ لیکن اس طرح انہوں نے "ترک" کا شعار اختیار کر کے مذہب کو فرد کی اصلاح تک محدود کر دیا۔ دوسرے وہ صوفی یا دیگر پاکباز بندے ہیں جنہوں نے مذہب کو ذاتی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا اور دراصل مذہب کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ انہیں پاکباز صوفیوں میں شاہ لطیف بھی تھے۔ اس طرز فکر کی تعمیر میں کئی عوامل کا دخل ہے خود انکی خاندانی روایات جو صاف ستھری اور بنیادی طور پر مذہبی تھیں۔ وحدت الوجود کا مسلک جو انکی ذات میں رچ بس گیا تھا اور انکی سیر و سیاحت اور بے شمار لوگوں سے ان کی

ملاقات، جس میں ہر قوم و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ اس وسعت نظر نے ان کا مرکز تو وہی رکھا لیکن دائرہ وسیع کر دیا۔ جہاں عقیدے کا حصار تنگ ہو رہا تھا اور کم جگہ کے سبب سے لوگ باہر نکلے جا رہے تھے وہاں شاہ لطیف نے محبت کے وسیع دائرے میں ہر ٹھکرائے ہوئے کو داخل کرنا شروع کر دیا ان کے گرد جو لوگ نظر آتے ہیں وہ معاشرے کے ہر طبقے اور گروہ کے ہیں مچھیرے ملاح، سادھو، محنت کش، کسان مرد عورت بچے بوڑھے سب ہیں۔ مگر یہ سوال کسی سے نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کس ملک، کس عقیدے، کس مذہب، کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ سب محبت کی ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ کے کلام کے پرستار اُنکے زمانے سے لے کر آج تک مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ھندو بھی ہیں اور جب عیسائیوں کی یلغار ہوئی تو وہ بھی اس دائرے میں سما گئے۔

اس دائرے کی دوسرے وسعت تصور کی دنیا سے آگے بڑھ کر عمل کی دنیا ہے۔ شاہ لطیف عقیدے اور محبت کی صرف تصوری دنیا میں نہیں رہے بلکہ انہیں حوالوں کے ساتھ وہ جہدِ مسلسل کا سبق دیتے رہے اور خود اس میں شریک رہے انھوں نے زمین سے اپنا رشتہ کبھی ترک نہیں کیا۔ اُنکا مذہب مجرد حقیقت نہیں بلکہ محسوس طرز زندگی ہے۔ زندگی ترک نہیں طلب ہے۔ ان کا مذہب عرفانِ ذات ہی نہیں عرفانِ حیات بھی ہے۔ انسان کی زندگی ایک آزمائش ہے، وعدہ الست میں اگرچہ اس نے اپنے مکمل بندہ ہونے کا اقرار کیا ہے لیکن خدا نے اسے آزادی دی تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ اس آزمائش سے کیسے گزرے گا اس آزمائش میں صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کیا سوچتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں نہیں کہ وہ کس بستر پر پیدا ہوا ہے بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے کیا سلوک روا رکھتا ہے۔

انسانوں اور زمین سے یہ رشتہ شاہ کو کسانوں میں لے جاتا ہے جہاں وہ بارش کی دعا مانگتے نظر آتے ہیں تاکہ اناج کی ارزانی ہو سر سبز زمین پر مویشیوں کیلئے چارہ ہو اور کسانوں کی محنت پھل ہو۔ کبھی وہ مچھیروں کی بستی میں انکی سلامتی کی دعا مانگتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ

تاجروں کو نصیحت کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بیکار نہ بیٹھو۔ اپنی کشتیوں کو صاف ستھرا اور مضبوط بناؤ اور اسکے کناروں کو چکنا رکھو کہ سمندر کا پانی انہیں سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ چکنے نہ ہوئے تو گل جائیں گے۔ کہیں وہ سوت کاتنے والیوں کو مسلسل کاتنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں اور خالی گذر جانے والے لمحوں کا احساس دلاتے ہیں۔ سرکا پائتی میں ایک معیار قائم کرتے ہیں جو ان کے پیغام کا نچوڑ ہے۔ وہ سوت کاتنے والیوں کو مسلسل محنت کی تلقین نہیں کرتے بلکہ بتاتے ہیں کہ بازار میں سوت پرکھنے والے یہ نہیں دیکھیں گے کہ یہ کتنا نفیس بنا ہوا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے یہ کتنی محبت سے کاتا گیا ہے۔ اور محبت سے کاتا گیا سوت چاہے موٹا جھوٹا ہی کیوں نہ ہو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

محبت، خلوص، لگن نصب العین سے وابستگی۔ اور جہد مسلسل، ثابت قدمی یہی معیار زندگی ہے اور یہی مذہب۔ یہی لطیف کا پیغام ہے اور یہی ان کا مذہب ہے۔

سر کا صدقہ دے کر سائیں پریتم گر مل جائے
ستا سودا جان کے عاشق، سر اپنا کٹوائے
قسمت جب بر آئے، تب ملتا ہے ساجن
(شاہؒ)

ڈاکٹر جمیل جالبی

شاہ عبداللطیف کی شاعری کے نئے گوشے

شاہ کی شاعری کا بنیادی فلسفۂ عشق ہے جس سے محبت، انسانیت، ملاپ اور یک جہتی کی وہ خوشبو نکلتی اور پھیلتی ہے کہ مشام جان معطر ہو جاتے ہیں۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے اور یہی پیغام وقت کا تقاضا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی (متوفی ۱۵۲ ۱ع) سندھی زبان کے وہ بے مثال شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمتوں سے سندھ کے عوام و خواص یکساں طور پر مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری دل کی آواز ہے اور اسی لیے دل میں اتر جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے صوفی شاعر ہیں جن کی شاعرانہ لے نے قرآن و حدیث کی روح کو معاشرے کی روح میں جذب کر دیا ہے۔ توحید ان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے جس سے فلسفہ و فکر کی وہ کرنیں پھوٹتی ہیں جو ساری زندگی کو منور کر دیتی ہیں۔ شاہ نے ایسی شاعری کی ہے جو بیک وقت مقامی بھی ہے اور ماورائے مقام بھی اور اسی لیے آج تقریباً ڈھائی سو سال بعد بھی وہ اسی طرح ترو تازہ اور پر اثر ہے۔

شاہ نے اپنی شاعری سے خود سندھی زبان کو نئی زندگی دی۔ اس میں وہ دل آویزی، جاذبیت اور اعلیٰ انسانی قدریں پیدا کیں کہ آج سندھی زبان ایک بلند مقام پر فائز ہے۔ شاہ نے اپنی شاعری سے دنیا کو انسانیت کا درس دیا اور انسانوں کو بحیثیت انسان بہتر انسان بننے کی تلقین کی۔ غریب عوام جو ظلم و استبداد کا شکار تھے شاہ نے ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ انہوں نے اپنے نغمات سے عوام کی ترجمانی بھی کی اور راہنمائی بھی۔ وہ وحدانیت کے متلاشی تھے جستجوئے حق اور قربِ الٰہی ان کا مسلک تھا۔ شاہ نے اپنی داستانوں میں جو خیال آرائی کی ہے اس میں سچائی اور حق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے آج شاہ کی مقبولیت کا یہ

عالم ہے کہ شاہ کا کلام زبان زدِ خاص و عام ہے۔ وہ محبت کے شاعر ہیں۔ وہ محبت جو انسان کو انسان سے قریب کرتی ہے۔ ان میں اتحاد اور پیار کا رشتہ پیدا کرتی ہے اور اخوت کے رشتے میں پرو کر معاشروں کو پرامن بنا دیتی ہے۔ شاہ نے انہیں خیالات کو تصوف کے حوالے سے اپنی شاعری کے ذریعے ساری معاشرے تک پہنچایا ہے۔ ان کے کردار دراصل استعارے ہیں جن سے ان کی فلسفۂ تصوف کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شاہ کا رسالہ ایک ایسا باغ ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول اور کلیاں کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حافظ و سعدی کی لے بھی شامل ہے اور رومی و عطار کا فلسفہ بھی۔ انسانی اقدار کی سربلندی اور پرامن معاشرے کا قیام ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ انہوں نے زمانے کے سرد و گرم کو خود چکھا۔ انسانیت کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ لق و دق صحراؤں کو عبور کیا۔ پہاڑوں کے دامن میں ڈیرہ جمایا۔ ریگستان کی تپتی ہوئی ریت پر بسیرا کیا۔ غربت کی تکالیف اٹھائیں۔ برفانی ہواؤں کا مقابلہ کیا اور بادِ سموم کے تھپیڑوں سے زندگی کے رازِ سربستہ کو تلاش کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے شاعری عوام کی روح سے قریب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری میں بلا کا سوز اور بلا کی تاثیر ہے۔ وہ بلکتی ہوئی انسانیت کو حوصلہ دیتے ہیں۔ وہ زندگی بسر کرنے کا شعور پیدا کرتے ہیں اور زندگی میں عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ وہی پیغام ہے جو قرآن پاک اور رسول ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ مولانا رومؒ کی آواز ان کی شاعری کی آواز میں شامل ہے اور اویس قرنی، سلمان فارسی اور ابوذر غفاری کا فلسفۂ حیات ان کی فلسفۂ حیات میں رنگ بھرتا ہے۔ شاہ سے پہلے یا شاہ کے بعد کسی شاعر نے، اس والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ، عوام کی روح کی اس طور پر ترجمانی نہیں کی۔ اسی لیے شاہ نے اپنی کلام میں اہلِ وطن کو اتحاد، اخوت، محبت اور بھائی چارے کی تعلیم دی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری خود منزل مقصود نہیں ہے بلکہ منزل پر پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

بڑے شاعروں نے ہمیشہ محبت ہی سے دنیا کو بدلا ہے اور شاہ لطیف بھٹائی نے بھی یہی کام اپنی شاعری سے انجام دیا ہے۔ شاہ لطیف کہتے ہیں:

"بلا کے پھیر دینا محبوب کی عادت ہے۔ یہ ایک الٹی
بات ہے مگر عشق کی ریت یہی ہے۔ اگر محبوب محبت
کا رشتہ توڑتا ہے تو وہی اسے جوڑتا بھی ہے۔"

اور پھر کہتے ہیں :

"اے طبیب! اٹھو، جاؤ اپنی دوائیں ساتھ لے جاؤ
وہی اپنے لطف سے میری چارہ سازی کریں گے
جنہوں نے مجھے درد بخشا ہے۔"

شاہ لطیف چارہ سازی کے لیے محبوب ہی کے پاس جاتے ہیں، طبیب کے پاس نہیں۔ یہی محبت مثبت رویہ ہے اور اسی رویے کو ہمیں بھی آج کے دور میں اپنانا چاہئیے کہ یہی تعلیم شاہ سائیں نے دی ہے اور اسی تعلیم سے ہم محبت کی رِیت جگا کر سندھ کو دوبارہ گلستانِ رنگ و نور بنا سکتے ہیں۔ شاہ صاحب کہتے ہیں :

اللہ نے دوست سے ملایا،
تجدید رسم و راہ کی بات چھیڑی۔
آئینِ مہر و وفا یہ ہے کہ ترک محبت نہیں کیا کرتے
(سر برو و سندھی داستان سوم)

ایک قصر در لاکھ، اور کروڑوں کھڑکیاں
جدھر اٹھے یہ آنکھ، ادھر ہے سندر روپ سجن کا
("شاہ")

آفاق صدیقی

سرچشمۂ محبت

جب اور جہاں کہیں بھی عظیم آفاقی شاعر اور سندھی زبان کے بے مثل و بے نظیر سخنور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ کا وجد آفریں کلام اپنی دیرینہ روایات کے ساتھ بیدار و سرشار ساعتوں میں شعر و نغمہ کا ارتعاشِ وجدانی پیدا کرتا ہے تو میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ سازو آواز کی یہ دلکشی، یہ مسحور کن روح پرور راگنی، سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی یہ نغمگی اور ہمارے کانوں میں پریم رس گھولنے والی یہ سرخوشی کوئی ایسی من موہنی چاشنی اور کوئی ایسا پیام جانفزا ضرور رکھتی ہے جو ہمیں اس محبت کا احساس دلا سکے جو حیات و کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ بھٹ دھنی کا گنجینۂ معانی جسے عرف عام میں "شاہ جو رسالو" کہا جاتا ہے درحقیقت عرفانِ محبت کا پیغام ہی تو ہے اور یہ سدابہار لافانی پیامِ محبت۔

اک انوکھی راگنی ہے روح پرور ساز میں
ایک البیلا سا نغمہ نت نئے انداز میں

وہ عجیب تاثیر ہے۔ وہ اچھوتا کیف و سرور ہے جو پیامِ لطیف کو حسن، صداقت اور محبت کی انمول قدروں سے مالامال کئے ہوئے ہے۔

حسن کی نیرنگیاں اور عشق کے رازو نیاز
ہم نے سب کچھ پالیا تیری مدھر آواز میں

یہ مدھر آواز، دلوں میں اتر جانے والی صدائے محبت اور زندۂ جاوید نغموں کی یہ ندائے جانفزا اس مقام سے گونجی جسے "بھٹ شاہ" کہا جاتا ہے شاہ بھٹائی کی ابدی آرامگاہ ایک روحانی مرکز اور ایک سرچشمۂ تہذیب و ثقافت۔

کہتے ہیں کہ ۱۶۸۹ء میں شاہ لطیفؒ کی ولادت باسعادت ایک ایسے محترم خاندان میں ہوئی جس کا شجرۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہ تک پہنچتا ہے۔اس خاندان میں جو بزرگان دین اور اولیائے کرام پیدا ہوئے ان میں شاہ عبدالکریم اس لحاظ سے بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں کہ اولیں دور کے مستند سندھی شعراء میں ایک بلند پایہ صوفی شاعر کی حیثیت سے ان کا کلام آج بھی بیحد مقبول ہے۔

شاہ صاحب کی والد بزرگ شاہ حبیب شاعری سے تو کوئی خاص شغف نہ رکھتے تھے تاہم ایک صوفی بزرگ کے طور پر بڑے معزز و محترم تھے۔شاہ بھٹائی کی والدہ محترمہ بھی بڑی عبادت گزار، سادگی پسند اور اسلام کے اوصاف حمیدہ رکھنے والی نیک دل خاتون تھیں جنہیں عربی زبان و ادب پر عبور حاصل تھا۔

شاہ صاحب کو بچپن ہی سے غور و فکر عبادت و ریاضت اور مظاہر فطرت کے مشاہدات کا بڑا شوق تھا۔جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی یہ ذوق و شوق بھی سوا ہوتا گیا۔جوان ہوئے تو سیر و سفر کی دُھن سمائی اور خدا جانے کہاں کہاں گھومتے پھرتے،دور دور کے بے آب و گیاہ صحراؤں بلند بالا پہاڑوں، خوفناک جنگلوں، سنسان بیابانو، ہرے بھرے میدانوں، سمندروں ور جھیلوں کے شاداب کناروں اور طرح طرح کی انسانی بستیوں کو دیکھتے بھالتے، بھانت بھانت کے آدمیوں سے ملتے ملاتے وہ سب کچھ حاصل کرتے رہے جو ان کے پر خلوص قلب نظر میں حیات و کائنات کے حسن و جمال اور اس حسن و جمال کے خالق و مالک سے سچی محبت پیدا کر سکے۔محبت کی اسی لگن نے شاہ بھٹائی کو شعر و نغمگی کا وہ جوہر کامل عطا کیا جو ان کی رگ رگ میں روح کی راگنی بن کر سما گیا۔

بڑے بڑے شہروں کے ہنگاموں سے دور جاہ و حشمت کے پرستاروں سے الگ تھلگ، حرص و ہوس کی دنیا سے بے نیاز تخت و تاج کی ریشہ دوانیوں سے بے پروا، اونچی حویلیوں اور عالیشان محلوں سے پرے، جبہ و دستار کی نمائشوں سے بیگانہ ریاکاریوں اور سطحی مفادات کے پھندوں سے آزاد، مال و دولت، نام و نمود اور عیش و عشرت کی سعی و طلب سے

بے تعلق بھٹ کے دھنی لالوں لال لطیف نے ایک غیر آباد مگر انتہائی پر سکون و پر فضا جگہ کو وہ رونق بخشی کہ رہتی دنیا تک بھٹ شاہ کو ایک ایسے مقدس مقام کی حیثیت حاصل رہے گی جہاں جوق در جوق ہجوم در ہجوم لاکھوں افراد عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے رہیں گے اور جہاں کا ذرّہ ذرّہ زبانِ حال سے یہ کہتا رہے گا۔

اے بھٹائی !کشورِ شعر و سخن کے تاجدار
تا ابد قائم رہے گا تیرے نغموں کا وقار
ہے تیرے ابیات میں سوز و محبت کا سرور
تیرا پیغام محبت اک اچھوتا شاہکار

"شاہ جو رسالو" اوّل تا آخر خلوص و محبت کا آئینہ دار ہے مگر یہ محبت وہ نہیں جو مادی آسائشوں اور محض ترغیبات کی محتاج ہو بلکہ یہ محبت اس عہد و پیماں کی محبت ہے جو روزِ ازل تمام روحوں نے اپنے خالق و مالک سے کیا تھا۔ یہ محبت ہادیٔ برحق، خاتم المرسلین، رحمت للعالمین، سرورِ دو عالم، فخرِ موجودات، محسنِ انسانیت، رسول کریم ﷺ کی محبت ہے۔ یہ محبت اُن پاکبازان صدق و صفا کی محبت ہے جو کڑی سے کڑی آزمائشوں میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہ محبت ان حق پرستوں کی محبت ہے جو کفر و باطل کی ترغیب و تحریص کو ٹھکرا کر سولی کو بھی سیج سمجھتے ہیں۔ یہ محبت بادۂ توحید کے ان تشنہ لبوں کی محبت ہے جو زہر کے پیالے پی کر بھی شاد کام نظر آتے ہیں۔ یہ محبت جہد البقا میں جادۂ خیر کشیدہ ہے۔ یہ محبت کائناتِ بیکراں اور مظاہر فطرت کی نیرنگیوں کا خمیر ہے۔ یہ محبت وہ ہے جو اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہے کہ سب کا پالنہار سب کا داتا اور ہم سب کا معبود حقیقی ایک اور صرف ایک ہے۔

اوّل نام اللہ کا سچا اور عظیم
قادر اپنی قدرت سے قائم اور قدیم
دونوں عالم کا دھنی اعلیٰ اور علیم
والی، واحد وحدہ رازق رب رحیم
بڑھ کر ہے ہر حمد سے وہ بے مثل حکیم
ہے سارے سنسار کا خالق وہی کریم

شاہ بھٹائی کے نزدیک محبت روحِ کائنات ہے۔ محبت روحِ حیات ہے، محبت روحِ عصر ہے۔ یہ روح رواں کہیں اڑتے بادلوں گھنگھور گھٹاؤں، تند و تیز ہواؤں، چمکتی دمکتی بجلیوں اور برسات کی رم جھم میں سموئی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں یہ رخِ حیات لہلہاتے کھیتوں، خوبصورت کھلیانوں اور خون پسینہ ایک کرنے والے کسانوں کی سانسوں میں شامل ہے۔ کہیں یہ محبت ساحل اور سمندر کی آغوش میں رہنے والے ملاحوں، بحری تاجروں اور جفاکش مچھیروں کا گیت ہے تو کہیں بھپرتی موجوں، اُٹھتے طوفانوں اور مچلتے گردابوں کا سنگیت ہے۔ کہیں یہ محبت کھلی فضاؤں میں کونجوں کی پکار ہے۔ کہیں اُجلے اُجلے ہنسوں کی قطار، کہیں چاند اور چاندنی کا نکھار، کہیں پنگھٹ پر پانی بھرتی گوریوں کی چوڑیوں کی جھنکار اور کہیں چرخہ کاتنے والی سہاگنوں کی چہکار۔ کہیں یہ محبت پیا ملن کے ارمانوں سے سرشار ہے اور کہیں جدائی کے دکھ درد کا اظہار۔

کہتے ہیں کہ سچی شاعری، فراق کی شاعری ہوتی ہے۔ شاہ بھٹائی نے عالم فراق کی سچی شاعری کو قلب و نظر کی کن گہرائیوں سے وجدانی سوز و گداز بخشا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے یوں تو "شاہ جو رسالو" کے بیشتر ابیات اور وائیوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے تاہم سر رپ، سر سسی سر سوہنی، سر مومل رانو، سر مارئی، سر لیلاں چنیسر اور کئی دوسرے سروں میں عالم فراق کی کربناکی نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ سسی جب اپنے پیارے پنہوں سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کا نالۂ فراق ایک ایسی طالبِ جاوداں میں ڈھل جاتا ہے کہ وہ تمام روح فرساد شواریوں سے بے پرواہو کر پنہوں اور صرف پنہوں کی یادوں میں کھو جاتی ہے۔

کہاں گیا وہ پنہوں پیارا کوئی مجھے بتلائے
سکھیو! اب بھنبھور میں مجھ کو پل بھر چین نہ آئے
سوگ میں جس کے ترس رہے ہیں پیا ملن کو نین
مجھ کو گہری نیند سلا کر کدھر گئی وہ رَین
آئے تھے میرے دیور بنکر کچھ کیچی سردار

لے گئے چھین کے بیری مجھ سے پریتم تیرا پیار
کھینچ رہی ہے میرے من کو کوئی سہانی آس
پنکھ لگیں اور اڑ کر پہنچوں میں پنھوں کے پاس
بسی ہوئی ہے تن من میں اس پردیسی کی پریت
میں پنہوں کی پریم دلاری پنھوں میرا میت
یہ پربت یہ کڑی دھوپ اور چٹیل میدان
الجھی الجھی کیچ کی راہیں میں برہن انجان
سر پہ دھول آنکھوں میں آنسو پاؤں تھکن سے چور
کس سے پوچھوں کون بتائے کیچ ہے کتنی دُور
تپتی ریت بھیانک جنگل ہر گھاٹی سنسان
ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں تجھکو نکل رہی ہے جان
ہاتھوں کے بَل چلوں گی پیارے جب نہ اٹھیں گے پاؤں
مجھکو تیری کھوج سے مطلب دھوپ رہے یا چھاؤں

ماروی جب اپنے من میتوں سے جدا کر کے عمر کوٹ کے محل میں قید کر دی جاتی ہے تو وہ شاہانہ عیش و عشرت کی کسی تحریص و ترغیب کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ اپنی عزت نفس اور محبت کے پاکیزہ جذبے کو بہر کیف اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ وہ عمر کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی بے خوفی سے عالمِ فراق کی اذیت ناکی اظہار کرتی ہے۔

عمر کوٹ میں کون ہے میرا میں اک دُکھیا نار
بچھڑ گئے وہ پیارے مارو اُجڑ گیا وہ پیار
میں کوئی دھن دولت چاہوں اور نہ چاہوں راج
عمر! مجھے تو جان سے بھی پیاری ہے اپنی لاج
راج محل کے شال دوشالے اوڑھ نہ میرے پاس

ڈھونڈھ رہی ہیں میری آنکھیں پیارے تھر کی گھاس
بسی ہے جبتک ان سانسوں میں کھیتوں کی بُوباس
لوٹ کے اپنے گھر جانے کو ٹوٹ نہ جائے آس
کہاں وہ سکھیاں برکھارُت اور ہرے بھرے میدان
کہاں یہ دکھ یہ درد یہ پیتا اور اکیلی جان
اسی طرح دن رات بہیں گے نینوں سے یہ نیر
دیکھ نہ لوں گی جب تک پھر سے پیارا دیس ملیر
عمر! میں تیرے محل کا پانی پیوں نہ کھانا کھاؤں
بھوک پیاس کے مارے چاہے تڑپ تڑپ مر جاؤں
مر جاؤں تو مجھ دکھیا پر اتنا ترس تو کھانا
جہاں ہیں پیارے مارو میری لاش وہیں پہنچانا۔

درحقیقت سر مارئی میں شاہ بھٹائی محبت کی ناقابلِ تسخیر قوت کو ایک ایسے نسوانی کردار کے روپ میں پیش کرتے ہیں جو وطن اور اہل وطن کی عزت و ناموس کا انتہائی جرأت مندانہ کردار ہے۔ وہ دوشیزہ صحرا جو سومرہ سردار کے محل میں قید ہے عیش و عشرت کی تمام خاطر و مدارات کو ٹھکرا کر، ظلم و ستم کی ہر زنجیر توڑ کر، حرص و ہوا کے ہر جال سے آزد ہو کر وہیں جانا چاہتی ہے جہاں اس کے پر خلوص وباوفا اہلِ وطن اپنے کچے گھروندوں اور لہلہاتے کھیتوں میں شاداں و فرحاں رہتے ہیں۔

سر مارئی کی ابتدا میں ہی شاہ صاحب مارئی کی زبانی یہ کہتے ہیں کہ ''روزِازل سے ہی میرے دل کو پیارے مارو کی محبت ملی ہے جب" اَلَستُ بِربِّکُم" کی آواز کانوں میں گونجی تھی تو میں نے تہہ دل سے قَالُو اَبلٰی کہا تھا اور اسی لمحے میں نے اپنے قبیلے والوں سے محبت کے عہد و پیمان کئے تھے۔ صدائے کن فیکون سے پہلے جب نہ کائنات کا کوئی وجود تھا نہ تخلیق آدم ہوئی تھی اور نہ گوشت پوست کے رشتے و پیوند تھے اس وقت ہی سے میرے اس

روحانی رشتہ مہر و وفا کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب کن فیکون کہہ کر خالقِ کائنات نے روحوں کو تخلیق کیا اور ان سب نے مل کر عہد میثاق کا حق ادا کیا اس وقت سے اب تک میں اپنے پیارے کی محبت کو دل میں بسائے ہوئے ہوں۔"

بھرپور تاثریت، متنوع منظر کشی، مقامی رنگ آمیزی، محاکاتی اندازِ بیان تمثیلی اظہار و ابلاغ، مترنم لب و لہجے ثقافتی جزئیات نگاری اور ماورائی رمز و کنایہ کی دل آویزی شاہ جو رسالو کو صرف اچھی اور سچی شاعری ہی کا اعلیٰ شاہکار نہیں بناتی بلکہ علم و عرفان کی بہترین قدروں کی بجاآوری اور بصیرت آموزی کا حق بھی ادا کرتی ہے۔

شاہ بھٹائی نے حیات و کائنات سے محبت کے ازلی و ابدی رشتے کا اظہار ایسی علامتوں اور ایسے جانے پہچانے کرداروں کی صورت میں کیا ہے کہ عوام اور خواص یکساں طور پر ان کے کلام سے خلوص و محبت کے حکیمانہ افکار و نظریات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سر سوہنی کے تجزیے میں روحانی معنویت کی علامتیں بظاہر ایک مشہور معروف عشقیہ داستان سے ماخوذ ہیں جن کا ادراک ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس نے یہ داستان سنی یا پڑھی ہے مگر ان علامتوں کی تہہ داریوں میں تصوف کی تعلیمات کے رموز و نکات پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سوہنی صرف سوہنی نہیں راہِ طریقت کی سالک ہے۔ ساحر، مہیار یا میہوال محبوب حقیقی کی علامت ہے۔ دریا طوفان، گرداب، اندھیری رات عالمِ اسباب کی آزمائشوں کے اشارے ہیں یہ وہ مراحل ہیں جو قدم قدم پر طالبِ حقیقی کا راستہ روکتے ہیں لیکن اس کا جذب صادق ان رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

سر سوہنی میں کچے گھڑے کا ذکر بھی ہے جو بیچ بھنور میں سوہنی کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے یہ کچا گھڑا ایسے سہاروں کی علامت ہے جو بظاہر دیرپا اور کار آمد نظر آتے ہیں مگر حقیقتاً بڑے ناپائیدار اور بے ثبات ہوتے ہیں۔

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی
نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی
وجودِ زندگی میں موجزن ہے
ربابِ روح کی نغمہ سرائی
وصالِ یار کی راحت پہ قرباں
ثوابِ زہد و رسم پارسائی

شاہ بھٹائی کے پیغام محبت میں انفرادی تگ و دو، اجتماعی جدو جہد، دوراندیشانہ مسلکِ حیات، انسانی اخوت و مساوات، ظاہری وباطنی صدق و صفا، غرور و تکبر سے گریز، امید افزا توکل و قناعت، بیداریٔ فکر و نظر، پر خلوص عبادت وریاضت کی برکتیں، ریاکارانہ نمود و نمائش کا خمیازہ، اہلِ دل کی قربت، خالقِ حقیقی اور رسولِ مقبول ﷺ پر ایمانِ کامل اور خیر کثیر کی ہر وہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے جو آدمی کو صحیح معنوں میں ایسا انسان بناتی ہے جس کا تن من محبت کی مہکار سے خلقِ خدا کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے اور کارسازِ حقیقی بھی اس کو اپنے بہت ہی پیارے بندوں میں شمار کرتا ہے۔

جو بھی قتلِ زلف ہیں اُن کو، کفن نہیں درکار
کہیں شہید کو بھی دیتے ہیں، غسل، کفن اے یار!
(شاہؒ)

ڈاکٹر بشیر احمد شاد

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام میں جہد و عمل کا پیغام

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا کلام آفاقی نوعیت کا حامل ہے۔ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا کلام جہد و عمل کا پیغام ہے اور شاہ صاحب پیامبر جہد و عمل ہیں یہاں ان دیوان "شاہ جو رسالو" کے مختلف سروں سے مشتے از خروارے کی مصداق چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں، جن میں کسی نہ کسی انداز میں جہد و عمل کا پیغام پنہاں ہے۔

سر ایمن کلیان

اس سر میں شاہ لطیف نے اہل اللہ کی تشبیہ ایسے لوہار سے دی ہے جو آگ کے نزدیک بیٹھ کر آگ کے شعلوں کی اذیتیں برداشت کر کے لوہا کوٹ کر رزق حاصل کرتا ہے۔ اور اگر وہ اتنی محنت و مشقت نہ کرے تو پھر اس کا شمار الکاسب حبیب اللہ میں نہیں ہوتا۔ اس طرح جو طالب المولیٰ عشق حقیقی کی راہ میں درپیش صبر آزما تکالیف برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتا اور نفس امارہ کو زیر کرنے کیلئے جدوجہد نہیں کرتا وہ اہل اللہ کہلانے کا کسی طور بھی مستحق نہیں بنتا۔

ڈُو ڈا ! تون نہ ڈِٺين! آگِ اوڏون وِجين!
اُلا جي عشق جا. سي تان تون نہ سَهين!
اُپوائن چَئين. ت آء آگَڙيو آهيان!

ترجمہ: تو نہ دھونکنی دھونکتا ہے اور نہ آگ کے قریب ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے شعلوں کی گرمی برداشت کرتا ہے۔ تعجب ہے کہ تو پھر بھی اہل اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

سر سہنی (سوہنی)

سر سوہنی میں بظاہر شاہ صاحب نے سوہنی کی میہنوال کے عشق میں جدوجہد کا نقشہ کھنچا ہے۔ فرماتے ہیں کہ خالی خواہش رکھنے والی عورتیں تو بہت سی ہیں جو کنارے پر کھڑی ہو کر میہنوال کو آواز دیتی ہیں مگر اترتیں نہیں۔ کیونکہ انہیں اپنی جان عزیز ہے۔ من کی مراد توانہی کو حاصل ہوتی ہے جو جان کی پرواہ کئے بغیر میہنوال کی محبت میں دہشتناک دریا میں گھڑا لے کر خود جاتی ہیں۔ انہی کو مقصد کے موتی حاصل ہوتے ہیں اور میہنوال ان پر ہی نظر کرم کرتا ہے۔

بباطن شاہ لطیف عارفوں اور عشاق کا ذکر فرماتے ہیں اور جھوٹے اور خود غرض انسانوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو محض زبانی خواہش کے عوض مالکِ حقیقی کی رحمت اور لطف و کرم کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ان کے من کی مراد پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کی محبت کے دعوے زبانی ہیں۔ جبکہ جو لوگ حق کی راہ میں جان تک کی پرواہ نہیں کرتے اور اپنا تن من دھن ہر چیز بخوشی حق کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے رب کریم کی نظر عنایت کے مستحق بن جاتے ہیں اور ایسے لوگ ہی اہل اللہ کہلاتے ہیں۔

حاصلِ مطلب یہ کہ عمل کے ذریعے ہی انسان اپنی عاقبت سنوار سکتا ہے اور دونوں جہانوں کی سرخروئی حاصل کرتا ہے۔

كَنذيَ اُپِيون كيتريون. ساهَڙُ ساهَڙُ كَنِ.
كنين سانگو سادَ جو . كي گھوريَسِ كيو گھڙن.
ساهَڙُ سَندو تَنِ. گھاگھائي گِھڙِنِ جي.

ترجمہ: کنارے پر کھڑی کئی زبانی خواہش رکھنے والی عورتیں محبوب میہنوال کو پکارتی ہیں مگر ان کو اپنی جان پیاری ہے۔ لیکن کچھ تو جان کی پرواہ کئے بغیر قربان ہونے کے جذبے کے ساتھ دریا میں کود پڑتی ہیں۔ میہنوال انہی کے حصے میں آتا ہے اور انہی کو چاہتا ہے۔

سر سسی آبری

سسی کے سارے سر آبری، حسینی، کوہیاری، معذوری، دیسی، جہد و عمل کے پیغام سے لبریز ہیں۔ سر سسی آبری کے ایک شعر میں شاہ لطیفؒ نے عقل کے اندھوں کی مثال ایسے انسانوں سے دی ہے جو دریاء کے کنارے رہتے ہوئے بھی پیاسے مرتے ہیں۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کیلئے ہاتھ پیر تو چلاتے نہیں اور اوپر سے اپنے آپ کو بہت مظلوم اور بیچارہ بھی سمجھتے ہیں۔

دراصل اس تمثیل کے ذریعے شاہ صاحب نے ان بد نصیب اور بیوقوف انسانوں کا ذکر فرماتے ہیں جو زندگی میں سوچنے اور ہاتھ پاؤں چلانے کے عادی نہیں ہوتے، وہ اپنے رب کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ جبکہ رب العالمین ہماری شہ رگ سے قریب تر ہے مگر وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ایسے انسانوں کو اپنے وجود کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں۔ وہ خود کو مظلوم تصور کرتے ہیں جبکہ دنیا سعی اور عمل کی جگہ ہے اور یہاں کا یہ دستور ہے کہ جو انسان اپنے مقصد کیلئے جدو جہد کرے گا وہی اسے پالے گا۔

پاڻيءَ مَنڍي جهوپــڙا. مــورک اُجَ مَــرَنِ.
ساها اوڏو سُپِــريــن. لوچــي تان نه لَهــنِ.
دَمُ نه سُجاڻَنِ. دانهوُن کن مَنَنِ جئَــن.

ترجمہ: دریا کے کنارے جھونپڑوں میں رہنے کے باوجود لوگ پیاسے رہیں تو وہ بیوقوف کہلائیں گے۔ محبوب تو ان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے مگر وہ اسے نہیں ڈھونڈتے۔ انہیں اپنے وجود کی اہمیت معلوم نہیں وہ تو فقط مظلوموں کی طرح چلاتے ہیں۔

سر حسینی

سر حسینی میں شاہ عبداللطیفؒ نے جہد و عمل کا عالمگیر پیغام دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ انسان کو سستی اور کاہلی کو ترک کرکے عزم اور حوصلے کے ساتھ مسلسل جہد و

عمل کے ذریعے اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہنا چاہئے۔ بصورت دیگر وقت کی لہر گذر گئی تو اس کا واپس ہونا محال ہے۔ پھر عشق حقیقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی وجہ سے صحیح راستے پر گامزن ہونا بہت مشکل ہو جائے گا۔ شاہ صاحب نے بظاہر یہ نصیحت سسی کو فرمائی ہے کہ اپنے پنوں کو تلاش کرنے میں سست روی اختیار نہ کرے۔

تَتيءَ تَتَئِي كاهِ . كانهي ويلَ وِهَڻَ جي.
مَتان تِئي اونداه. پيرُ نه لَهين پِرينءَ جو.

ترجمہ: ایسے مشکل وقت میں تمہیں رکنا نہیں ہے۔ ممکن ہے تھوڑی دیر میں اندھیرا چھا جائے اور پھر تو اپنے محبوب کے قدموں کے نشان تک نہ پا سکے۔

سر مومل رانو

سر مومل رانو میں شاہ لطیف نے زندگی کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے اور وقت کی قدر کرنے کی تلقین کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس زمین پر ہم گھوم پھر رہے ہیں، سیر سپاٹے کر رہے ہیں اور اسے بے دردی سے روند رہے ہیں اس کے اندر ہمارے پیارے عزیز واقارب آرام فرما ہیں۔ کئی جیالے جوان اس مٹی میں مدفون ہیں اور ہم نے کئی ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ زندگی پانی کا بلبلا ہے اس دو دن کی مختصر اور ناپائدار زندگی کے وقت کے سرمائے کو ہم خیال سے خروج کریں اپنی زندگی کا مقصد متعین کر کے محنت اور مشقت، جہد و عمل سے دونوں جہانوں میں سرخروئی کا سامان پیدا کریں۔

جاپون پيرين مون. ساپون مَتي سَجٽين.
ڏِگ لَنبا ڏوڙِ ۾ ، اُپــي ڏِٺاســـونَ.
ڏِينهن مِڙيئي ڏونَ. اُتي لوچ لَطيف چَئي.

ترجمہ: جو زمین ہمارے پیروں کے نیچے ہے، وہی زمین ہمارے کئی عزیز واقارب کے اوپر ہے

یعنی وہ اس کے اندر دفن ہیں۔ ہماری آنکھوں نے کئی جیالوں کے اس زمین میں دفن ہونے کے دردناک مناظر دیکھے ہیں۔ یہ زندگی دو دن کی ہے اس لئے اس میں جدو جہد جاری رکھنا لازمی امر ہے۔

سر کیدارو

سر کیدارو میں شاہ صاحب جہد و عمل کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہی کہ ایسے انسان ہر وقت حق کی راہ کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ وہ جیالے میدانِ رزم میں صف شکن بن کر آگے بڑھتے ہیں اور دشمن کو کیفر کردار تک پہنچا کر واپس لوٹتے ہیں۔ ایسے دلیر انسان ہمیشہ سینہ سپر ہو کر مقابل پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اپنے سینے پر وار برداشت کرتے ہیں۔ ایسے سرفروشوں کی مجاہد بیویوں کو اپنے جیالے سپاہیوں کی تیمارداری کرنے میں بہت خوشی ہوتی ہے اور ان کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ پیٹھ پر وار کھانے والے تو بھگوڑے اور بزدل کہلاتے ہیں۔ ایسے بزدلوں کی بیویاں شوہروں کو اپنے لئے ندامت اور شرمساری کا باعث تصور کرتی ہیں۔ مرنے مارنے کا خیال تو فقط سرفروش، صف شکن مردِ مجاہد ہی کر سکتا ہے۔ اپنے جیالے اور سرفروش خاوند کے متعلق اس کی بہادر بیوی کے تاثرات بیان کرتے ہوئے شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں:

پَھگو آئون نہ چَوان. مارِيو تہ وِسَهان.
كاندَ مُنهَن م ذَكَرا. سيكِيندي سونهان.
تہ پڻ لَجَ مَران. جي هُونِ پُٺِ م.

ترجمہ: میدانِ جنگ سے فرار اختیار کرنا میرے نزدیک قابلِ مذمت ہے۔ میرا محبوب دشمن کو جہنم رسید کرے تو بات ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ میرا محبوب سینے پر زخم کھا کر لوٹے۔ اس کی تیمارداری کرتے ہوئے بہت فخر محسوس کروں گی۔ اور وہ پیٹھ پر زخم کھا کر لوٹے تو شرم سے میری گردن جھک جائے۔

سر کاپائتی

کاپائتی کا مطلب چرخے پر سوت کاتنے والی عورت ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس سر میں سچے عارف کی مثال اس عورت سے دی ہے۔ سوت کاتنے یا چرخہ چلانے سے مراد اللہ پاک کی عبادت کرنا ہے۔

یہ دنیا عمل اور سعی کی جگہ ہے، جہاں انسان کو مقصد کے گوہر حاصل کرنے کیلئے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ دنیا کے کاروبار کی طرف نظر دوڑانے سے یہی اصول کا فرما نظر آتا ہے۔ اس سر میں شاہ لطیفؒ بظاہر اس عورت سے مخاطب ہیں جسے چرخہ پر سوت کاٹ کر گذارہ کرنا ہے مگر اس عمل میں انسان کے لئے بیداری کا سبق سمایا ہوا ہے۔ زندگی کے مقصد کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مالک حقیقی کی عبادت اور اطاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ محنت اور جہد و عمل کی عظمت بتلائی گئی ہے اور عارف کو سیدھی راہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

شاہ لطیف سوت کاتنے والی عورت کو ہدایت فرماتے ہیں کہ جو گھڑی بیت گئی ہے اسے واپس نہیں لوٹنا۔ اس لئے وقت کی قدر کرنا سیکھو اور چرخہ چلا کر جتنا بھی سوت کات سکتی ہو کات لو۔ ہر سوت کاتنے والی عورت محنت اور مشقت کرتے ہوئے اچھی لگتی ہے۔ جن کو محنت کی عظمت کا احساس ہوتا ہے وہ چرخہ سے الگ نہیں ہوتیں۔

اسی طرح خداوند کریم کے ہاں وہی بندے مقبول ہوتے ہیں جو وقت کو امانت جان کر اس کی قدر کرتے ہیں اور جہد و عمل کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوڑتے۔ ایسے انسان ہی سچے عارف اور اہل اللہ کہلاتے ہیں۔

جان کَتين تان ڪتُ. هيءُ هَڏِ وِهاڻي.
ڪاپائِـتي سَپ ڪا. ڪِـتـي سـيباڻي.
جاڻو جِن جاڻي . تِن هَنئان پَهي نه چِڏي.

ترجمہ۔ وقت گذر جا رہا ہے اس لئے اٹھ چرخہ چلا کر سوت کات لے۔ ہر سوت کاتنے والی

عورت محنت اور مشقت کرتے ہوئے اچھی لگتی ہے۔ جنھوں نے وقت کی اہمیت کو جان لیا، انہوں نے چرخے کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔

اس سر میں شاہ لطیفؒ سوت کاتنے والی عورت کو بیتے وقت کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اس لئے وقت کی قدر کرنا سیکھو۔ چرخہ چلا کر محبت کے ساتھ محنت کرو۔ انجانوں اور بے وقوفوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھو۔ اگر تجھے آج احساس نہ ہوا اور آنکھیں موند لیں تو کل سودا کرنے والے بیوپاری بے توجہی سے ساتھ کاتا گیا سوت ترے منہ پر ماردیں گے اور پھر اس وقت تجھے پشیمانی سے ہاتھ ملنے پڑیں گے۔

بباطن شاہ صاحب غافل انسانوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کرتے ہیں اور اسے اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ زندگی کا سورج ڈوبنے والا ہے۔ کوئی عاقبت کی فکر کر۔ غافلوں کی طرح وقت کی پونجی کو ہاتھ سے نہ گنوا، بلکہ پورے خلوص دل سے جدوجہد کے ذریعے اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کر۔ ورنہ ریاکاری سے بھرپور اور خلوص سے خالی عمل قیامت کے روز تیرے منہ پر مار دئے جائیں گے۔

هي هنڌ و هاڻي. تون ڪڙه ڪالوني ڏينهن ڪي
اتي اور ارت سين. ويھ م ويڳاڻي
نه صراف سياڻي. موٽائي هنني نه ٿي

ترجمہ: وقت گذرا جاتا ہے، تجھے کل کی فکر کرنی چاہئے۔ اٹھ اور چرخہ چلا کر محنت کا ت۔ یوں انجانوں کی طرح آنکھیں موندے نہ بیٹھ۔ ورنہ کہیں کل ایسا نہ ہو کہ تیری بے توجہی سے کاتا ہوا سوت تیرے منہ پر واپس مارا جائے۔

سر پربھاتی

اس سر میں شاہ لطیف نے بتایا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ...

یہاں جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ رب کے حضور وہی انسان مقبول ہیں جو خلوص دل سے اس کے احکامات کا بجا آوری کرتے ہیں۔ ایسے انسانوں پر قادر مطلق اپنی خاص نظر کرم کرتا ہے۔

ذات پات اور رنگ و نسل کی بنا پر کسی انسان کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔ اچھے اعمال ہی کردار کی کسوٹی ہیں۔ زندگی کی تعبیر عمل ہی سے ہے۔ جو انسان اپنے مالک حقیقی کی غلامی قبول کر لیتے ہیں اور اس کے حکموں کی بجا آوری کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خوف سے گھبراتے ہیں اور اسی طرح عبدیت کا حق ادا کرتے ہیں، اس پر خداوند تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے اور انہیں اپنے پیاروں میں شامل کر لیتا ہے۔ پھر ایسے انسانوں کی نازبرداریوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ جو لوگ ساری ساری رات جاگ کر اپنے رب کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی عبادت بیکار نہیں جاتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ذاتِ نه آهي ذاتِ تي. جــو وَهي ســو لَهي.
آريون اَبــوجَهنِ جــوئن. سَــپَــرُ جامُ سَهي.
جوراء وَتْ راتِ رَهڻي. تنهن جُکي تان نه تئي.

ترجمہ: ذات پات سے کسی کی بڑائی شمار نہیں ہوتی۔ جو محنت کرتا وہی اس کا پھل پاتا ہے۔ خدا تعالیٰ انہیں لوگوں کی جو سادہ لوح اور عبادت گذار ہوتے ہیں نازبرداریاں سہتا ہے۔ اور ایسے لوگ ہی اس مالک مہربان کی حفاظت میں ہوتے ہیں۔

ساری رات لمبی تان کے سونے والے غافل ہوتے ہیں۔ اس غفلت کی نیند کی وجہ سے بیشمار لوگ مقصد حیات بھول جاتے گئے۔ رب العزت کی رضا حاصل کرنے کے لئے تو بڑے جہد و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاہ صاحب ایسے غافل انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اس طرح کب تک سوتا رہے گا۔ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر اللہ کی عبادت کر اور خوف خدا میں زارو قطار نیر بہا اور گڑگڑا۔ اپنے گناہوں کی معافی طلب کر۔ کیا خبر کہ کل تیرے لئے آئے بھی یا نہ آئے۔ اس لئے آج ہی اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر۔ فرض کر کہ اگر کل تو باقی نہیں رہتا تو پھر تیری جمع کردہ ہر ایک چیز یہاں پر پڑی رہے گی مگر تو نہیں

ہو گا۔ موت کا کوئی موسم مقرر نہیں اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ شاہ لطیف نے اس مفہوم کو کس خوبصورتی سے الفاظ کی مالا میں پرویا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

ستو ڪيئن ننڊون ڪرين، روءِ وهاڻي روءِ

سيا ساز سنڌوءِ پيو هوندو پٽ ۾

ترجمہ: غافلوں کی طرح تو نیند کی گود میں کس طرح لیٹا ہوا ہے، رات کے پچھلے پہر اٹھ کر خدا کو یاد کر اور اس کے خوف میں اپنی آنکھوں سے آنسو بہا۔ ممکن ہے کہ کل تو باقی نہ رہے۔ پھر تیرا مال و اسباب یہیں رہ جائے گا اور تو زمین کے اندر چلا جائے گا۔

سرڈہر

بیداری زندگی کی دلیل ہے اور زندگی سے مراد حرکت ہے، نیند غفلت اور موت کی علامت ہے۔ جس میں جمود اور بے حسی ہے۔ اس سر میں شاہ لطیف مقصد حیات کا احساس دلاتے ہوئے غافل انسان سے مخاطب ہیں۔ اسے بیدار ہونے کا سبق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مقصد حیات غفلت کی نیند سونے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے تو بڑی محنت اور مشقت اور جہد و عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو سوئے گا وہ کھوئے گا اور جو جاگے گا وہ پائے گا کے مصداق خالقِ اکبر کی رحمت کا مستحق وہی بنے گا جو راتوں کی نیندیں قربان کر کے ذکر الٰہی کی طرف راغب ہو گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

سُتا! اُٿــي جاڳ، ننڊَ نه ڪجي ايتــري،

سُلطاني سُهاڳ، ننڊُنِ ڪَندي نه ملي.

ترجمہ: اے غافل انسان اٹھ نیند سے بیدار ہو جا۔ اتنی غفلت مضر ہے تجھ پر رب کی رحمت جب ہو گی جب تو نیند ترک کر کے یاد الٰہی میں راتوں کو جاگے گا۔